۷۸۶
۹۲

آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت کا ترجمان

بظلِ عاطفت سرکار مفتیٔ اعظم ہند بریلی شریف

ماہنامہ
پاسبان
الٰہ آباد

ایڈیٹر: مشتاق احمد نظامی

بیادگار سلطان الہند عطاء رسول خواجۂ خواجگان
خواجہ غریب نواز اجمیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ
زیر سرپرستی سلطان المناظرین حضرت مولانا رفاقت حسین صاحب قبلہ
مفتی اعظم کانپور سربراہ اعلیٰ آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت
بظل حمایت حاجی بڈن صاحب رضوی منڈگوڑ حاجی محمد سعید صاحب رضوی باسنی
معین بابو رئیس راجگانگپور، چودھری محمد علی صاحب مکرانہ، حافظ احمد رسول صاحب
حاجی خلیل احمد صاحب تسر جناب واجد حسین صاحب رضوی جھریا

جلد ۳۵ | ماہ جنوری ۱۹۸۰ء | شمارہ ۱

اس دائرہ کا سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے۔
—— منیجر

قیمت سالانہ ۱۶ روپئے
فی پرچہ ۱-۵۰

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ:
منیجر دفتر پاسبان، الٰہ آباد

انوار احمد نظامی پروپرائٹر اینڈ پرنٹر و پبلشر نے تاج آفسٹ پریس الٰہ آباد سے چھپوا کر دفتر پاسبان، الٰہ آباد سے شائع کیا۔

مشتاق نظامی

شذرات

عُلمائے تبلیغی کو ہدیۂ تبریک و تہنیت

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

تحریک خواہ سیاسی ہو یا مذہبی اگر اس میں بڑھنے اور قبول عام ہونے کی صلاحیت ہے تو عموماً ایسی تحریکیں تین دورے گذرتی ہیں ۔ عہد طفولیت عہد شباب اور عہد کہولت ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جماعتوں کا شباب و بڑھاپا ہماری جوانی اور بڑھاپے سے الگ ڈھنگ ہے ۔

آدمی بڑھاپے میں قدم رکھنے کے بعد خواہ وہ کتنا ہی "لیت الشباب یعود" کا وظیفہ پڑھے ۔ اب وہ جوانی کی سرحدوں میں قدم نہیں رکھ پاتا لیکن تحریکوں میں رجعت قہقری ہوتی ہے ۔ جوانی سے بڑھاپے اور بڑھاپے سے جوانی کی طرف ان کا الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے ۔ چونکہ تحریکیں بذات خود متحرک نہیں ہوتیں بلکہ ان کا کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے ۔ اس لئے جماعتی حرکت کو محرک کے قوت وضعف سے متاثر ہونا ایک امر ناگزیر ہے ——

اگر یہ کوئی ضابطہ ہے تو "سنی تبلیغی جماعت" کو بھی ان ادوار سے گذرنا ہے ۔ جب ضرورت برسوں پہلے میں نے سنی تبلیغی جماعت کا اعلان کیا ابتداءً میں نے ماہنامہ "پاسبان" ہی کو اس کی تشہیر و فروغ کا ذریعہ قرار دیا ۔ پھر یہ تذکرہ ہماری نجی مجلسوں میں ہوتا رہا ۔ اس طرح ہم اپنے بہت سے دینی بھائیوں کو اپنا ہم خیال بناتے رہے ۔

امید افزا حالات کے پیش نظر مجلسوں کا ذکر جلسوں تک پہنچ گیا ۔ اس طرح اپنے خطاب عام میں اپنا درد جگر سب کو تقسیم کرتا رہا ۔ گویا دھیرے دھیرے یہ تحریک اپنی منزل کی جانب بڑھتی رہی ۔ اور تدریجاً میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اب میں اس راہ کا تنہا مسافر نہیں ۔ حتیٰ کہ میرے قوت باز عزت مآب الحاج شیخ محمد اسمٰعیل صاحب رضوی بیڑی مرچنٹ تمسر نے بڑی حوصلہ مندی اور فراخدلی سے اس دینی تحریک کا ساتھ دیا اور اسّی ہزار سے زائد مختلف دینی اور اصلاحی کتابچے اپنے فرم کی جانب سے مفت تقسیم کرائے ۔ اور وقتاً فوقتاً آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ موصوف ہی کے زیر اہتمام سات آٹھ علماء پر مشتمل ایک ماہ کا تبلیغی دورہ ہوا جو کودرما ضلع ہزاری باغ سے شروع ہو کر گمّا کولہ پر ختم ہوا ۔ ان واقعات کے سپرد قلم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ "تنہا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا" اگر یہی جذبہ مختلف دلوں میں ترجائے اور تقسیم کار کے تحت جماعت کے اہل ثروت، مخیر اور درد مند حضرات الگ الگ کام اپنے ذمے لیں تو یہ دینی تحریک کمدی بیل کی طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی جائے ——

خدا کا شکر ہے کہ مناظر اہلسنت مقرر گرامی حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب اشرفی رضوی مفتی ناگپور نے مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کا کام بحسن وخوبی سنبھال لیا ہے۔ اور تقریباً اپنے ہر پروگرام میں سنی تبلیغی جماعت کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ موصولہ اطلاعات سے ہم اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ سنی تبلیغی جماعت مولانا کا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ مقرر گرامی مولانا عبد الرزاق صاحب جبل پوری آرگنائزر سنی تبلیغی جماعت نے کرناٹک، حیدرآباد اور آندھرا پردیش وغیرہ میں اس کا صحیح تعارف کرایا۔ اور ان صوبوں میں تدریجاً جماعتی کام آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح فاضل جلیل مولانا جلیل احمد مصباحی معتمد دار العلوم غریب نواز نے راجستھان کا جزوی کام سنبھال رکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں بھیلواڑہ، مکرانہ باسنی، ناگور شریف، پالی، چتوڑ گڈھ اور بیکانیر وغیرہ میں سنی تبلیغی جماعت نہ صرف متعارف ہو چکی ہے بلکہ راجستھان کے مختلف مقامات پر درس قرآن کا سلسلہ سنی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام جاری ہے۔

ہم اس مقام پر عزت مآب الحاج محمد سعید صاحب رضوی برادرم فاروق پہلوان بھیلواڑہ، مولانا ظہور احمد صاحب، الحاج چودھری محمد علی صاحب مکرانہ۔ الحاج محمد علی جناح صاحب، جملہ ائمہ مساجد مکرانہ، اور دیگر رفقاء جماعت کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے حسب مقدرت سنی تبلیغی جماعت کا کام سنبھال رکھا ہے۔

مولانا حافظ حکیم انصار احمد صاحب امام جامع مسجد دھانو گاؤں نے گجرات کے جنوبی علاقے میں کام کو سنبھال رکھا ہے۔ شیخ طریقت حضرت مولانا خواجہ نظام الدین صاحب بدایونی کا حلقہ متوسلین سنی تبلیغی جماعت کا قوت بازو بن چکا ہے۔ عزیزم مولوی مسعود دھانورڈو، شریف بھائی سنجان، رفاعیہ سلسلے کے چیمن والے باپو، احمد سیٹھ وابی یہ سبھی حضرات سنی تبلیغی جماعت کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے ہیں۔

اس سلسلے میں بمبئی کی رفتار بہت سست تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ ادھر سلسلہ مقدمہ کئی بار بمبئی جانا پڑا تو اس سفر میں ائمہ مساجد کی متعدد نشستیں ہوئیں اور انتہائی بحث وتمحیص کے بعد ائمہ مساجد نے اس دینی تحریک کو قبول کر لیا اور مقرر گرامی جناب مولانا حافظ قاری عبد القیوم صاحب خطیب مکہ مسجد گھاٹ کوپر کی سربراہی میں سنی تبلیغی جماعت اپنے شباب کی طرف بڑھ رہی ہے اور بمبئی کے اکثر مساجد میں سنی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام درس قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیا کہنا ہے بھیونڈی کے شیر دل، ہوش مند اور جیالے بیٹوں کا جنہوں نے اس روشن چراغ کو طوفانوں اور آندھیوں کی ہر زد سے محفوظ کر رکھا ہے۔ بھیونڈی کی مساجد میں درس قرآن تو ہو ہی رہا ہے۔ اب ان کے تبلیغی وفود بھیونڈی سے باہر سیکڑوں میل تبلیغی دورہ بھی کرنے لگے ہیں۔

یہ سہرا عزیزم انور علی انصاری بی کام، سکریٹری سنی تبلیغی جماعت کے سر ہے۔ جنہوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں سے اس دینی تحریک کا نام روشن کر رکھا ہے اگر انہیں سونے میں بھی تولا جائے تو کم ہے۔ محترم مولانا امام علی صاحب، مکرمی مولانا عبد الشکور صاحب، محبی مولانا سمیع اللہ صاحب، ماسٹر شبیر احمد صاحب ماسٹر خلیل احمد صاحب، حافظ محمد ادریس صاحب اور دیگر رفقاء جماعت ہدیہ تبریک وتہنیت کے مستحق ہیں۔ جن کے مساعیٔ جمیلہ اور حسن تدبیر نے جماعت کو استحکام بخشا ہے۔ یہ اطمینان بخش صورت ہے کہ اب بمبئی کے علماء بیدار ہو گئے ہیں۔ اور وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے سنی تبلیغی جماعت کو ایک دینی تحریک کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

یہ جان کر ناظرین کو مسرت ہوگی کہ پورنیہ کی مرکزی جماعت "تنظیم المسلمین" بائسی نے اصولی طور پر سنی تبلیغی جماعت کو منظور کر لیا ہے۔ اب اس طرح اس کا دائرہ عمل پورنیہ سے دارجلنگ، سلی گوڑی، کرسیانگ، جلپائی گوڑی، گوہاٹی، اور شیلانگ تک پھیل جائے گا۔ "تنظیم المسلمین بائسی" کے روح رواں مولانا رحمت حسین، مولانا عبد العزیز، مولانا امام مظفر صاحب، مولانا حسن منظر قدیری، مولانا مفتی مطیع الرحمن مضطر، مولانا ابو العلاء، مولانا معین الدین اور مولانا غلام مصطفیٰ رشیدی نے سنی تبلیغی جماعت کو اپنے دستوری دفعات میں شامل کر لیا ہے۔

یں تقریباً نو برس کے بعد دو ہفتے کے لئے یورنیہ گیا۔ "تنظیم المسلمین بائسی کی کارکردگی دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ انشاءاللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں علاقائی سطح پر "تنظیم المسلمین" اہلسنت کی واحد نمائندہ جماعت تصور کی جائے گی۔

میں لکھنا کچھ چاہتا تھا۔ مگر جماعت کے ہلکے پھلکے تعارف میں الجھ کر رہ گیا۔ میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ اسے تنذرات کی دوسری قسط میں حاضر کرونگا اسس تعارف میں ایک بہت ہی معروف شخصیت رہ گئی۔ وہ ہیں۔ رئیس ملت عزت مآب الحاج بڈن صاحب۔ رضوی۔ صدر مدرسہ دستگیریہ منڈگوڑ، جن کی خاموشس خدمات سے سنی تبلیغی جماعت کا چراغ روشن ہے۔ انشاءاللہ ان کے تعارف میں جماعت ایک کتابچہ شائع کرے گی۔

درخواست علماء اور ائمہ مساجد سے گذارشس ہے کہ جن جن مقامات میں سنی تبلیغی جماعت کا کام ہو رہا ہے۔ وہ حضرات اپنا مکمل نام اور پتہ ارسال فرمائیں۔ تاکہ "پاسبان" میں ان کی دینی خدمات کے تذکرہ کے ساتھ جماعتی رابطہ پیدا کیا جاسکے۔

ایک مرد مجاہد نے اسلاف کی یاد تازہ کردی

حضور مجاہد ملت کی عظیم المرتبت شخصیت سے اپنے و بیگانے سبھی واقف ہیں۔ وہ علم کے سمندر اور زہد و تقویٰ کی آپ اپنی مثال ہیں، عزم راسخ کی چٹان اور ہمت بلند کے کوہ گراں ہیں۔ مسلک اور عقیدے کا تصلب ان کا خمیر و ضمیر اور سرشت و فطرت ہے۔ وہ عموماً ایسی سنگلاخ زمین کے مسافر ہیں جو ان کے امثال و معاصرین کے لئے انتہائی دشوار گزار ہوتی ہے۔ ایک حق نگر، حق پسند اور حق گو کی حیثیت سے بلندی میں ثریا سے بھی آگے ہیں۔ وقت کی صحیح آواز پر لبیک کہنا یا وقت کے تقاضے پر قوم کو دعوت عمل دینا ہی ان کا شیوہ رہا ہے جو کام قوم سے لینا ہوا سے خود کر دکھایا کٹھن سے کٹھن موڑ پر چلنا ہو تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے ساتھی کی تلاش میں بیٹھے نہ رہے اٹھ کھڑے ہوئے اور تنہا چل دیئے۔ یہ اور بات ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ان کی حق پسند طبیعت کو کبھی بھی کوئی خارجی دباؤ کتمان حق پر آمادہ نہ کر سکا۔ حق گوئی اور بے باکی یہ ان کی فطرت ثانیہ نہیں بلکہ یہی عین فطرت ہے۔

جس عقیدے کا پرچار انھوں نے ہندوستان میں کیا اسی کو حرم کعبہ میں کہا اور گنبد خضریٰ کی چھاؤں میں کہا۔ امسال بھی وہ سفر حجاز کے لئے روانہ ہوئے غالباً یہ حضرت کا چھٹا یا ساتواں سفر ہوگا اور وہاں کے قاضی نے پھر اسی رسم کہن کو دہرایا کہ آپ علیحدہ نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اسی موضوع پر اس طرح کا مباحثہ اور مناظرہ ہو چکا ہے۔

حضرت نے اپنے دلائل و شواہد پیش کئے۔ مگر یہ سب تو دکھاوے کی باتیں تھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طے شدہ منصوبہ تھا اور اسی بہانے حضرت کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ کاشس ہندی علماء اور ہندی سنی عوام حضرت کا ساتھ دیدیئے ہوتے تو یہ ایک مستقل تحریک بن جاتی۔ سوال ایک فرد کا نہ ہوتا بلکہ ایک جماعت کا ہوتا ــــ اس کے بعد کیا کچھ ہوا میں رو سکتا ہوں لکھ نہیں سکتا اگر میں نے طبیعت پر قابو پا یا تو آئندہ کچھ لکھوں گا۔

نعت شریف

حضرت اسمٰعیل کلیم شفائی

ہمارے خامہ و گفتار کی بات اور ہوتی ہے
نبیؐ کے اُسوہ و کردار کی بات اور ہوتی ہے

یہاں دم توڑ دیتی ہے مسیحا کی مسیحائی
شہِ کونین کے بیمار کی بات اور ہوتی ہے

یہاں بھی ہے اسی کا سایۂ رحمت مگر پھر بھی
مدینے کے در و دیوار کی بات اور ہوتی ہے

حصارِ زیست ہی تک ساتھ دیتی ہے جہانبانی
گدائے سیدِ ابرار کی بات اور ہوتی ہے

مقدس آفریں ہے جنتِ فردوس بھی لیکن
مدینے کے گل و گلزار کی بات اور ہوتی ہے

مجھے بھی بخش دے یارب وہی ایثار و دلداری
دلِ صدیق سا دلدار کی بات اور ہوتی ہے

الٰہی ملتِ مرحوم کو پھر وہ تدبر دے
عمر فاروق کے افکار کی بات اور ہوتی ہے

دلوں کو روح کو ایثارِ عثمانی عطا کر دے
شہیدوں کے طریقِ کار کی بات اور ہوتی ہے

عطا کر پھر مجھے وہ بازوئے مشکلکشا یارب!
کہ تیغِ حیدرِ کرار کی بات اور ہوتی ہے

مجھے بھی دین کی خدمت کا جذبہ کر عطا یارب
رہِ قدس میں انصار کی بات اور ہوتی ہے

درِ خیر الوریٰ سے کوئی بھی خالی نہیں جاتا
مگر محتاج اور نادار کی بات اور ہوتی ہے

میں بک جاؤں مدینے میں بنامِ مصطفیٰ یارب
کہ اُن کے کوچہ و بازار کی بات اور ہوتی ہے

کلیمؔ ناتواں ان کی عقیدت اور محبت میں
ترے ڈوبے ہوئے اشعار کی بات اور ہوتی ہے

حضرت مولانا محمد احمد صاحب مصباحی

امام اعظم کی علمی بصیرت

ناموران اسلام میں علمی بصیرت، فنی مہارت، فقہی صلاحیت طبعی جدت، ذہنی فطانت، فہم و فراست، عقل و تدبر، سیاسی شعور اور مذہبی بالغ نظری کے اعتبار سے سیدنا امام اعظم کی ذات انتہائی بلند قامت شخصیت تصور کی جاتی ہے۔ جب آپ کی سیرت و سوانح کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تو آپ افق علم پر ایک درخشندہ ماہتاب کی طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی علمی بصیرت و برتری کے سلسلہ میں معاصرین کی آراء ملاحظہ ہوں کیونکہ کسی شخصیت کی علمی و فنی حیثیت کا اعتراف معاصرین تو بڑی فیاضی و فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم عصر علماء و فضلاء کا سینہ اس معاملے میں بڑا ہی تنگ ہوتا ہے۔ معاصرانہ چشمک اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی اپنے ہی دور کے کسی صاحب علم کی فضیلت و برتری کا اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اعتراف کر لیا جائے۔ ذیل میں ہم چند جلیل القدر ہستیوں کے تاثرات قلم بند کر دیتے ہیں۔ جو حضرت امام اعظم کے معاصرین میں سے تھے۔ اور اپنی جگہ انفرادی شخصیت کے مالک تھے۔

معاصرین کی رائیں

حضرت معر بن کدام فرماتے ہیں، میں نے امام ابو حنیفہ سے بہتر گفتگو فقہ میں کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں علم فقہ میں لوگ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی عیال ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اہل کوفہ میں سب سے بڑے فقیہ ہیں۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ سے زیادہ میں نے کسی کو عالم اور فقیہ نہیں پایا۔ حضرت خارجہ بن مصعب فرماتے ہیں۔ میں نے تقریباً ایک ہزار علماء، فضلاء سے ملاقات کی ان میں سے کسی کو علم و عقل، فہم و فراست اور بصیرت و مہارت کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ کے مشابہ کبھی نہ پایا۔ حضرت عفان بن سیار فرماتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ ایسے طبیب حاذق ہیں۔ جو ہر مرض کی دوا جانتے ہیں حضرت امام مالک فرماتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اگر اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں۔ تو اپنی دلیلوں سے اسے سونا ثابت کر دیں گے۔

(مناقب النعمان للمکی ص ۳۶ تا ۹۶، ج ۲)

مندرجہ بالا اقوال اگرچہ امام صاحب کی علمی بصیرت کے لئے سند نہیں قرار دیئے جا سکتے تاہم حقائق و معلومات کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہمارے ذہن کو ہموار ضرور کر سکتے ہیں۔

ذہنی تربیت میں ماحول کا اثر

صحیح صحت مند معاشرہ حکیمانہ ساخت، و پرداخت اور بہتر طریقے کی ذہنی تربیت نے امام صاحب کے علمی و فنی نشو نما میں بہت اہم اور نمایاں رول ادا کیا۔ امام صاحب کا آبائی پیشہ تجارت تھا اور آباؤ اجداد اس پیشہ سے حد درجہ شغف رکھتے، مگر زیور علم کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے بلکہ علماء و فضلاء سے تعلقات اور ان کی مجلس میں نشست و برخاست اپنے لئے لازم سمجھتے چنانچہ آپ کے دادا حضرت نعمان بن مرزبان تو باب العلم سیدنا مولائے کائنات علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں اکثر جاتے رہتے۔ اور نذر و نیاز، تحفہ و تحائف بھی پیش کیا کرتے جیسا کہ ردالمحتار میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

والنعمان بن المرزبان
ابو ثابت هو الذی
اهدی لعلی الفالودج

نعمان بن مرزبان حضرت ثابت
کے والد ماجد نے پارسیوں
کے عید نوروز کے دن فالودہ

فی یوم المھرجان فقال علی مھرجونا کل یوم ھکذا۔
(رد المحتار ص۴۵، ج ۱)

بطور تحفہ حضرت علی کے ... بھیجا تو حضرت علی نے کہا ... ہمارے یہاں ہر روز نو... ہے۔

یہ تو آپ کے جد امجد کی بات ہے والد ماجد حضرت ثابت تو صغر سنی سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور خیر و برکت کی دعاؤں سے نوازے جاتے۔

وذھب ثابت الی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وھو صغیر قد عالم بالبرکتہ فیہ وفی ذریتہ ونحن نرجوا ان اکون اللہ قد استجاب لعلی فینا۔
(رد المحتار ص۴۵، ج ۱)

حضرت ثابت بچپن میں حضرت علی کے بارگاہ میں حاضر ہوئے تو حضرت علی نے ان کے اور ان کے خاندان کے واسطے دعا فرمائی، ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ نے مولائے کائنات کی دعا مقبول فرمایا۔

جن کے تعلقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوں گے ان کے عادات و اطوار اور علمی منزلت کا کیا حال رہا ہو گا؟

گھریلو ماحول کی صفائی ستھرائی اسی معیار کی رہی ہوگی ظاہر ہے کہ امام صاحب کی ذہنی تربیت میں یہ سبھی چیزیں ممد و معاون ثابت ہوئی ہوں گی۔

تحصیل علم

پیشہ تجارت وراثۃً آپ تک منتقل ہوا تھا اسی لئے آپ بھی تجارت ہی میں مصروف رہے۔ اور اپنی خوش معاملگی صدق و دیانت اور حسن تدبیر سے ترقی حاصل کرتے رہے۔ اس وقت کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ تعلیم کا کوئی خاص زور نہ تھا۔ لیکن سلیمان کے عہد میں جب تعلیم و تعلم اور درس تدریس کے چرچے عام ہونے لگے۔ تو آپ کے دل میں بھی حصول تعلیم کا داعیہ پیدا ہوا۔ مشیت ایزدی سے انہیں دنوں ایک ایسا اتفاقی واقعہ پیش آیا۔ جس سے آپ کے ارادے کو اور زیادہ تقویت ملی ہوا یوں کہ ایک روز اپنے تجارتی کام سے بازار جا رہے تھے۔ امام شعبی کا اتفاقاً سامنا ہو گیا۔ انھوں نے آپ کو کوئی نوجوان طالب سمجھ کر اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ آپ نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبی نے فرمایا میرا مطلب یہ ہے کہ کس سے پڑھتے ہو؟ آپ نے افسوس کے ساتھ جواب دیا کسی سے نہیں! تب امام شعبی نے فرمایا مجھے تمہارے اندر قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ اس نصیحت نے آپ کے دل میں گھر کر لیا اور نہایت شوق و لگن سے تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔

شروع شروع میں امام صاحب علم کلام کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جس قدر عمر اور تجربہ بڑھتا گیا علم کلام سے طبیعت ہٹتی گئی۔ اور علم فقہ کی طرف مائل ہوتے گئے۔ آخر کچھ دنوں بعد حضرت حماد کے حلقہ درس میں جا بیٹھے۔ امام صاحب کو پہلے دن پچھلی صف میں بیٹھنے کو جگہ ملی۔ کیونکہ اس زمانے میں مبتدیوں کے لئے عموماً یہ امتیاز رکھا جاتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حضرت حماد کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں کوئی شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں آپ کا ہم پلہ نہیں۔ تو حکم دے دیا کہ ابو حنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں۔ آپ نے اسی زمانے میں حدیث کا درس حاصل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اسی زمانے میں آپ نے زبان و ادب، صرف و نحو، قرأۃ و تجوید در تفسیر و کلام وغیرہ پر قدرت حاصل کر لیا تھا۔ امام صاحب کو کوفہ کی درس گاہوں سے بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لیے حرمین جانا بھی ضروری تھا پہلے مکہ گئے۔ پھر تحصیل علم کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں کے بزرگوں سے تحصیل علم فرمایا۔ باوجودیکہ آپ کے طالب علمی کا میدان مدینہ منورہ تک محدود ہے مگر حصول علم کا سلسلہ اخیر زندگی تک قائم رہا۔ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں قیام فرماتے۔ امام صاحب کی علمی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بڑے بڑے اہل کمال کی صحبتیں آپ کو میسر آئی تھیں۔ علماء سے ملنے اور علمی جلسوں میں شریک ہونے کا شوق آپ کے ضمیر میں داخل تھا۔ علاوہ ازیں آپ کی شہرت اس حد تک ہو گئی تھی کہ جہاں جاتے تھے افادہ و استفادہ، ملاقات اور مباحثہ و مناظرہ کی غرض سے خود ان کے گرد ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا تھا۔

امام صاحب کے زمانے میں ماحول یہ تھا کہ ہر مجتہد یا استاذ

اپنا حلقہ درس الگ قائم کرلیا کرتا تھا۔ حضرت حماد ہی کی زندگی میں آپ نے اجتہاد کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا۔ لیکن آپ کے شاگردانہ خلوص نے یہ گوارا نہ کیا کہ استاذ کے ہوتے ہوئے اپنا دربار الگ جمائیں۔ اسی لئے حضرت حماد کے وصال کے بعد جب لوگوں نے آپ کو ان کی جگہ پر باقاعدہ بٹھایا تو بدرجہ مجبوری آپ نے اسے قبول کیا۔ اولاً حضرت حماد کے شاگرد قدیم درس میں شریک ہوتے رہے۔ مگر چند دنوں میں آپ کی وہ شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کر آپ کے حلقۂ درس میں ضم ہوگئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود آپ کے اساتذہ مثلاً معر بن کدام اور امام اعمش وغیرہ۔

آپ سے استفادہ کی غرض سے مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے اور دوسروں کو ترغیب بھی دیا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کے درس میں شریک ہوا کرو۔ کیونکہ وہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کے متعلق مسائل کے استفسار پر جواب دینا بلکہ خود ہی تمام شعبہائے حیات سے متعلق سوال پیدا کرنا اور ان سوالوں کا جواب دے پھر اپنے شاگردوں کو ان کی تعلیم دینا اور ان میں استنباط و اجتہاد کا ملکہ پیدا کرنا صرف امام ابوحنیفہ ہی کے حلقۂ درس کی خصوصیت ہے۔

امام صاحب کی علمی بصیرت پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کو فن تفسیر میں جو مقام حاصل تھا اسے اجاگر کیا جائے، صرف و نحو پر جو عبور تھا اسے بیان کیا جائے، قرأۃ و تجوید میں جو معلومات رکھتے تھے اسے ظاہر کیا جائے، زبان و ادب پر جو قدرت تھی اسے سامنے لایا جائے۔ فن حدیث میں جو حیثیت تھی اسے پیش کیا جائے۔ علم کلام میں جو کامل دسترس تھی اس کو لکھا جائے۔ اور علم فقہ میں جو انفرادیت تھی اسے قید تحریر میں لایا جائے مگر اس مضمون میں ہم صرف ان فنون کو پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ جن میں امام صاحب کافی شہرت رکھتے تھے۔

علم کلام میں کامل دسترس اسلام جب تک عرب میں رہا اہل عرب مسائل شرعیہ کو خلوص و اعتقاد کی نظروں سے دیکھتے رہے اور اس پر عمل پیرا رہے۔ لیکن اسلام جب عرب سے نکل کر فارس و شام اور دیگر عجمی ممالک میں پھیلنے لگا تو نہایت دقیق بحثیں شروع ہوگئیں۔ عام اعتقادی مسائل تک میں بھی موشگافیاں شروع ہوگئیں۔ اسی لئے رایوں کے اختلاف سے مختلف فرقے بنتے گئے اور یہ فتنہ یہاں تک بڑھا کہ اہل حق جواب تک ان بحثوں سے الگ تھلگ تھے۔ ان کو بھی غلط نظریات کی مخالفت کی غرض سے میدان میں آنا پڑا۔ اس طرح علم کلام وجود میں آیا۔ علم کلام اگرچہ ایک زمانے کے بعد مدون و مرتب ہو کر اکتسابی علوم میں داخل ہوا۔ لیکن امام صاحب کے وقت تک اس کی تحصیل کے لئے صرف قدرتی ذہانت اور مذہبی معلومات درکار تھیں اور قدرت نے امام صاحب میں یہ باتیں جمع فرما دی تھیں۔ مذہبی مسائل اور روایتیں کوفہ میں ایسے عام تھے کہ ایک معمولی شخص بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں بیٹھ اٹھ کر انھیں حاصل کر سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ نے اس فن میں وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ فن آپ سے بحث کرتے ہیں جی چراتے تھے۔ یہاں تک کہ اس فن میں کامل مہارت کے لئے لوگوں کی انگلیاں آپ ہی کی طرف اٹھتی تھیں آپ خود فرماتے ہیں۔ کنت انظر فی الکلام حتی بلغت فیه مبلغا یشار الی فیه بالاصابع (للمکی ص ۵۹ ج ۱)

پہلے میں علم کلام سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ میری طرف اشارے کئے جاتے تھے۔

آپ کئی مرتبہ بصرہ بھی تشریف لے گئے۔ چونکہ وہ گمراہوں کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں اکثر آپ سے بحث و مباحثے اور مناظرے و مجادلے ہوتے مگر مقابل کو راہ فرار کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا امام صاحب خود ہی فرماتے ہیں۔

قال ابو حنیفة رحمة الله
کنت رجلا اعطیت
جدلا فی الکلام فمضی
دهر فیه اتردد وبه

میں ایک ایسا شخص تھا جسے علم کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی ایک زمانہ ایسا گذرا کہ میں انھیں بحثوں میں مشغول رہتا اور

اخاصم وعنہ وانا مثل وکان اصحاب خصومات والجدل اکثرھا بالبقرۃ فدخلت البصرۃ نیفاد عشرین مرۃ منھا ما اقیم سنہ او اقل او اکثر وکنت قد نازعت طبقات الخوارج من الاباضیہ والصفریہ وغیرھم من طبقات الحشو۔ (تکملی صفحہ ۵۵ ج ۱)

چونکہ اختلافات کا اکھاڑا زیادہ تر بصرے میں تھا اس لئے میں تقریباً وہاں ۲۰ مرتبہ گیا اور کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں اباضیہ، صفریہ وغیرہ اور حشویہ کے مختلف طبقوں سے مناظرہ کرتا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا خارجیوں سے ایک مناظراتی مکالمہ ملاحظہ فرمایا جائے جو اپنے اندر علمی بصیرت، عقل وتدبر کے ساتھ ساتھ دلچسپ انداز بیان اور طرز استدلال رکھتا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف اردو ترجمہ ہی ملاحظہ فرمائیں ـــــ

جب خارجیوں کو یہ معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ گناہ کی وجہ سے اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے تو آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے ۷۰ آدمیوں کا ایک وفد بنا کر آپ کی مجلس میں گھس آئے اور تلواریں سونت لیں لعن طعن بکنے کے بعد کہا کہ آپ کا قتل کرنا ہمارے نزدیک ۷۰ سال جہاد کرنے سے بہتر ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ پر ظلم کریں اس لئے آپ سے مباحثہ کرنا چاہتے ہیں تو امام صاحب نے فرمایا اگر تم انصاف کرنا چاہتے ہو تو اپنی تلواریں نیام میں کر لو اور جس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہو کرو۔ تب خارجیوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور سوال کیا کہ مسجد کے دروازے پر دو جنازے ہیں ایک ایسے شرابی کا جو شراب پیتے پیتے مر گیا۔ اور ایک ایسی عورت کا جو زنا سے حاملہ ہو گئی مگر شرم کے مارے خودکشی کر کے مر گئی۔ امام صاحب نے پوچھا یہ دونوں کس ملت سے تھے ـــ کیا یہودی تھے؟ انھوں نے کہا نہیں پوچھا عیسائی تھے؟ کہا نہیں! پوچھا مجوسی تھے وہ بولے نہیں۔ امام نے کہا پھر آخر وہ کس ملت سے تھے؟ انھوں نے جواب دیا اس ملت سے جو کلمۂ اسلام کی شہادت دیتی ہے۔ امام نے فرمایا بتاؤ یہ ایمان کا ½ یا ⅓ یا ¼ کتنا حصہ ہے؟ وہ بولے ایمان کا تہائی چوتھائی حصہ نہیں ہوتا۔ امام نے فرمایا اس کلمے کی شہادت کو آخر تم ایمان کا کتنا حصہ مانتے ہو؟ وہ بولے پورا ایمان! اس پر امام نے فوراً کہا جب تم خود انھیں مومن کہہ رہے ہو تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ وہ کہنے لگے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ وہ دوزخی ہے یا جنتی؟ امام نے جواب دیا اچھا اگر تم پوچھنا ہی چاہتے ہو تو میں ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام نے ان سے بدتر گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا ـــ اے خدا جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو غفور الرحیم ہے (سورہ ابراہیم آیت ۳۶) اور جو اللہ کے ایک اور نبی عیسٰی علیہ السلام نے ان سے بھی زیادہ گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا۔ اگر تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کرے تو زبردست اور دانا ہے (سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸) اور جو اللہ کے ایک تیسرے نبی حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا ان لوگوں کا حساب لینا تو میرے رب کا کام ہے کاش تم سمجھو اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔ (الشعراء آیت ۱۱۳-۱۱۴) اس جواب کو سن کر خارجیوں کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا۔ اپنے باطل نظریات سے توبہ کیا اور جماعت اہل سنت کی طرف رجوع کر لیا

(تکملی صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۵ ج ۲)

فن حدیث میں آپکی حیثیت

فن فقہ میں امام صاحب نے زیادہ تر حضرت حماد کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن علم حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی کیونکہ اس میں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہ چل سکتا تھا بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی بھی ضرورت تھی چونکہ حدیث اس وقت نہایت غیر مرتب اور منتشر تھی یہاں تک کہ بڑے اساتذہ فن دو چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہ رکھتے تھے اس لئے امام ابوحنیفہ کو نہایت سعی واہتمام سے حدیثوں کے جمع وترتیب کی طرف توجہ مبذول کرنی پڑی۔ کوفہ میں تقریباً کوئی ایسا محدث

نہ تھا جس کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔ ابوالمحاسن شافعی نے آپ کے اساتذہ کی تعداد ۹۳ بتائی ہے۔ جو صرف کوفہ کے رہنے والے یا نزیل تھے۔ سیرت کی دوسری کتابوں میں تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب نے تقریباً چار ہزار علماء سے تحصیل علم فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب نے ایک گروہ کثیر سے روایت فرمائی ہے جس میں ۲۹ اشخاص کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں اکثر تابعین کے زمرے سے تھے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ امام سفیان ثوری اور حضرت امام احمد بن جنبل (جنہیں حدیث کا امام تصور کیا جاتا ہے) وغیرہ کا سلسلہ سند اکثر انھیں بزرگوں سے ملتا ہے) امام ابوحنیفہ کو فن حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا اس بحث کے فیصلہ کے لئے ان کی علمی و عملی زندگی کے ان واقعات پر نظر ڈالنی چاہیئے جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں۔ غور کیا جائے کہ جس شخص نے ۲۰ سال ہی کی عمر سے علم حدیث پر توجہ دینی شروع کر دی ہو اور ایک مدت تک اس شغل میں مشغول رہا ہو اور جس کو مدینہ کے شیوخ حدیث سند فضیلت سے نوازیں بھلا وہ حدیث میں کتنا بلند پایہ علم اور کس مرتبہ کا شخص ہوگا

یہی وجہ تو تھی کہ جب محدثین میں کسی کو کسی حدیث میں شبہ یا اختلاف ہو جاتا تھا تو امام صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور اپنا شبہ یا اعتراض پیش کرتے جس کا آپ ازالہ فرماتے۔

قال زفر بن الھذیل کان کبراء المحدثین مثل زکریا بن ابو زائدہ وعبد الملک بن ابی سلیمان واللیث بن ابی سلیم ومطرف بن طریف وحصین وغیرھم یختلفون الی ابی حنیفۃ ویسألونہ عما ینبوھم من المسائل ومایشتبہ من الحدیث۔ ذکلی ص۱۲۹ ج ۲

حضرت زفر بن ھذیل فرماتے ہیں محدثین عظام جیسے زکریا بن ابوزائدہ، عبداللہ بن سلیمان لیث بن ابو سلیم، مطرف بن ظریف اور حصین وغیرہ کسی مسئلہ یا حدیث میں اختلاف کرتے یا شبہ ہوتا تو حضرت ابو حنیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور ان سے دریافت کرتے۔

حضرت ابن مبارک تو یہاں تک فرماتے ہیں

اوتاد الکوفۃ اربعۃ سفیان الثوری ومالک بن مغول وداؤد الطائی وابوبکر النھشلی وکلھم جالس یاحنیفۃ وحدث عنہ

اوتاد کوفہ چار ہیں سفیان ثوری، مالک بن مغول، داؤد طائی اور ابوبکر نہشلی سبھی ابوحنیفہ کے پاس بیٹھتے اور ان سے حدیث لیتے۔؟

علم فقہ میں آپ کا انفرادی مقام

گذشتہ صفحات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت امام ابتداً دیگر علوم وفنون سے شغف رکھتے تھے۔ فقہ کی طرف مائل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ سے ایک مسئلہ دریافت کیا آپ نے فرمایا حضرت حماد سے جاکر پوچھ لو اور مجھے بھی بتاتی جانا، چنانچہ اس نے دریافت کرکے آپ کو بھی بتایا۔ اسی وقت آپ تمام علوم سے نظر پھیر کر تحصیل علم فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ امام صاحب نے علم کلام کی طرف توجہ فرمایا کہ اس کا انجام کیا ہے تو سوائے تاریکی کے کچھ نہ سمجھ میں آیا کیونکہ اس سے لوگوں کو کماحقہ، نفع حاصل کرنے کا موقع نہ ملے گا۔ علم ادب ونحو اور شعر گوئی کا انجام بھی اس سے مختلف نظر نہ آیا پھر فن تفسیر کی طرف نظر فرمایا دیکھا کہ اس میں وقت نظر اور باریک بینی کی ضرورت ہے اور حدیث کی خاطر ایک طویل عمر چاہیئے ہاں؛ فقہ ایک ایسا فن ہے جو ہر اعتبار سے ٹھیک ہے۔ اس سے کماحقہ افادہ واستفادہ کیا جا سکتا ہے لوگوں کو نفع بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ اخلاق واطوار سنوارے جا سکتے ہیں۔ جس سے ادائیگی فرض بھی ہو سکتا ہے۔ اقامت دین بھی ہو سکتا ہے اور طاعات وعبادات بھی کی جا سکتی ہیں اور طلب دنیا وآخرت بھی ہو سکتی ہے انہیں وجوہات وخیالات کی بنا پر اس فن کی طرف متوجہ ہوئے۔

حضرت امام اپنے استاد حضرت حماد کے وصال تک مکمل اٹھارہ سال تک تحصیل فقہ کرتے رہے۔ استاد حماد کے وصال کے بعد بالاتفاق استاد کے جانشین بنائے گئے اور اس سند پر ۳۰ سال تک درس وتدریس اور افتاء کا شاندار کارنامہ انجام دیتے رہے جو آج مذہب حنفی کی بنیاد ہے اس تیس سال کی مدت میں ساٹھ ہزار بروایت دیگر پچاسی ہزار قانونی مسائل کے جوابات دیئے۔

علم فقہ میں حضرت امام جمیع فقہاء سے منفرد نظر آتے ہیں۔ آپ نے اس فن میں سب سے بڑا انفرادی کارنامہ اسلامی قوانین کی تدوین کا انجام دیا ہے۔ داخلی طور پر مالیات کے مسائل، تجارت و زراعت اور صنعت و حرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دستوری و دیوانی اور فوج داری قوانین و ضوابط کے مسائل اور خارجی طور پر جنگ و صلح سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری و بری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل کی تدوین کی۔ جن کی طرف دیگر ائمہ وفقہاء کا دھیان بھی نہ گیا ہوگا۔ لیکن امام نے اپنی بد اپنی صلاحیت و قابلیت اور کردار و دقار کے بل پر سبھی کو حل کیا جو کتنے ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بنا اور مسلم مفکرین قانون کے لئے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھل گیا بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے وہ اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے۔ اس سے الگ ہوں۔ مگر ان کے لئے نمونہ امام ہی تھے۔ جنہیں سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام شافعی جیسا جلیل القدر امام مایۂ ناز فقیہ حضرت امام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں

من ارادہ یعرف الفقہ	جو شخص علم فقہ حاصل کرنا چاہے
فلیلزم ابا حنیفۃ واصحابہ	تو اسے لازم ہے کہ امام ابو حنیفہ
فان الناس کلھم عیال	اور ان کے اصحاب کو مشعل
علیہ فی الفقہ۔	راہ بنائے اس لئے کہ فقہ میں
(تکملی ص ۳۱ ج ۲)	سبھی لوگ ان کی عیال ہیں۔

آپ کی ذہانت و فطانت

ذہانت و طباعی اور سوجھ بوجھ امام صاحب کا خاص وصف ہے۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گذرے ہیں ان میں ابو حنیفہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اور واقعی یہ حقیقت ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلوں میں آپ کا ذہن اس تیزی سے کام کرتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔

اکثر موقعوں پر آپ کے ہمعصر جو معلومات کے لحاظ سے آپ کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ موجود رہتے اصل مسئلہ سے انہیں واقفیت رہتی لیکن جو واقعہ درپیش ہوتا اس سے مطابقت کرکے فوراً جواب دے دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔ چند واقعات حسب ذیل ہیں جن سے امام صاحب کی ذہانت کے ساتھ ساتھ علمی بصیرت اور فقہی تفرد کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا اور قسم کھاکر کہا جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے نہ بولوں گا۔ عورت بھی تندمزاج تھی جھٹ قسم کھا کر اس نے بھی وہی الفاظ دھرا دیئے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت غصہ میں دونوں کو کچھ نہ سوجھا مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو افسوس ہوا۔ شوہر حضرت سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کیا۔ حضرت سفیان نے فرمایا گفتگو کروگے تو قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اس سے چارہ نہیں ہے وہ مایوس ہوکر امام ابوحنیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کرنے کے بعد کہا کہ للہ کوئی تدبیر بتائیں۔ امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو کسی پر کفارہ نہ ہوگا۔ حضرت سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو بے انتہا برہم ہوئے اور امام صاحب سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتاتے ہیں۔ امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور اس سے فرمایا کہ تم دوبارہ صورت مسئلہ بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا امام صاحب حضرت سفیان ثوری کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہا ہے۔ حضرت سفیان ثوری نے پوچھا کیوں؟ امام صاحب نے فرمایا عورت نے شوہر کو وہ الفاظ مخاطب کرکے کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو گئی۔ پھر قسم کہاں باقی رہی۔ تب حضرت سفیان نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ جو بات آپ کو وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال بھی نہیں پہنچتا۔

مندرجہ ذیل واقعہ بھی قارئین کے لئے انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہوگا۔ علاوہ ازیں امام صاحب کی سریع الذہنی اور ذکاوت وفطانت کے گوشوں کو بھی اجاگر کرنے میں مدد دے گا۔ ایک شخص نے قسم کھائی کہ اگر آج میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاقیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ آج کی میری کوئی نماز قضا ہو تو

میری زوجہ مطلقہ ہے پھر کہا اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کروں تو اس کو طلاق۔ لوگوں نے امام صاحب کے بارگاہ میں آکر مسئلہ پوچھا اور عرض کیا کوئی صورت ہے جس کو بروئے کار لاکر ان تینوں باتوں کو پورا کیا جا سکے اور طلاق بھی واقع نہ ہو۔ امام صاحب نے فرمایا ہاں! وہ شخص نماز عصر پڑھ کر اپنی بیوی سے ہم صحبت ہو۔ غروب آفتاب کے بعد غسل جنابت کر کے فوراً مغرب کی نماز ادا کرے اس صورت میں اس کی تینوں شرطیں پوری ہو جائیں گی۔ اور طلاق بھی واقع نہ ہوگی کیونکہ بیوی سے ہمبستری بھی ہوگا اور کوئی نماز بھی قضا نہ ہوگی اور غسل جنابت اس وقت کرے گا جب آفتاب غروب ہو چکا ہوگا اور دن بھی گزر چکا ہوگا۔ اس لئے کہ بعد غروب رات کی ابتدا ہو چکی ہوگی اور اگر دن کو صورت مسئولہ میں رات کے اعتبار سے مانا جائے تو تاریخ بھی بدل چکی ہوگی اس لئے کہ اسلامی تاریخ غروب آفتاب سے ہی بدل جایا کرتی ہے۔

ایک واقعہ اور نذر قارئین ہے اس واقعہ میں امام صاحب کی الزامی اور حاضر جوابی کی قوت کا پتہ چلتا ہے اسے بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا المنصور کا عرض بیگی ربیع انتہائی کمینہ خصلت انسان تھا۔ امام صاحب سے بے انتہا عداوت رکھتا تھا وہ ایسے موقع کی تاک میں رہا کرتا تھا جس سے آپ کی ذلت و رسوائی اور سبکی کا سامان فراہم ہو سکے۔ ایک مرتبہ امام صاحب المنصور کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ ربیع بھی موجود تھا آپ کو دیکھ کر عداوت کی آگ میں جل بھن گیا اور المنصور سے کہا کہ حضور یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتا ہے اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز بعد بھی انشاء اللہ کہہ دے تو اسے قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کو پوری کرنا ضروری نہیں۔ مگر ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ لفظ انشاء اللہ اگر قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا۔ ورنہ بعد میں کہنے سے لغو و بے اثر ہے۔ اس پر امام صاحب نے فرمایا امیر المومنین ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں المنصور نے کہا وہ کیسے؟

امام صاحب نے فرمایا ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرتے ہیں گھر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے۔ اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔ یہ سن کر المنصور ہنسا اور ربیع سے کہا تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑو ان پر تمہارا وار نہیں چل سکتا۔ امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا آج تو آپ میری جان ہی لے چلے تھے۔ امام صاحب نے مسکرا کر فرمایا یہ تمہارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی ہے۔

قارئین کرام! اس قسم کے سیکڑوں عنوانات قائم کر کے امام صاحب کی علمی بصیرت سے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے یہ چند سطور ہم نے صرف "بطور نمونہ" پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ تاکہ لوگ امام صاحب کے کور باطن حساد کے دام تزویر میں نہ پھنسیں بلکہ حقائق و معلومات کے اجالے میں امام صاحب کی ذات عالی صفات کا مطالعہ کر کے ان کی بلند شخصیت کو خراج عقیدت پیش کریں۔

حضرت امیر خسرو کا بقیہ صفحہ ۳۲ سے آگے

عبادت الٰہی، ذکر رسول، یاد الٰہی، آہ و بکا کو آپ نے مشغلہ بنا لیا اور حضور محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ وصال کے ٹھیک چھ ماہ بعد بروز چہار شنبہ بتاریخ ۱۰ر شوال ۷۲۵ھ کو آپ نے وصال فرمایا اور اپنے مرشد کے پہلو میں آج تک آرام فرما رہے ہیں۔ علیہ الرحمۃ والرضوان۔

جشنِ استقبالیہ

پاسبان کے خصوصی نمائندہ کے قلم سے

پٹنہ ۲۸؍ اکتوبر۔ آج عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیوٹ کی پرشکوہ عمارت میں ادارہ مذکورہ کے بزم ادب کی طرف سے منعقدہ تقریب میں مولانا حسن رضا خاں کو ایک شان دار استقبالیہ دیا گیا۔ مولانا حسن رضا خاں۔ ایم اے نے ابھی حال ہی میں اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں رضی اللہ تعالےٰ عنہ پر ریسرچ کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

اس طرح کی تقریب پٹنہ کی تاریخ کی غالباً پہلی تقریب تھی۔ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی روایت اب تک قائم نہیں ہوئی تھی۔

اس جشن میں شرکت کرنے کے لئے پٹنہ اور مضافات کے ارباب علم و دانش کی ایک بھیڑ اکھٹی ہو گئی تھی۔ اس جشن میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندگان شریک اجلاس ہوئے۔

اس جشن میں عطارد رقم مصنف بھی تھے، زہرہ نگار ادیب بھی خوش خیال شعرا بھی تھے اور فلک وقار خطیب بھی۔ یہاں وطن کی آبرو بھی تھی، سماج کا بھرم بھی۔ علم کا پندار بھی تھا۔ فکر کی نخوت بھی۔

خرد کی نامسلمان بھی تھی، جنوں کی پختہ زناری بھی ———

مذہبی درسگاہوں کے سربراہوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اور فلاحی و سماجی اداروں کے کارکن بھی تشریف لائے تھے۔ قومی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔ اور ملی تنظیموں کے رضا کاروں نے بھی حصہ لیا تھا۔ غرض پٹنہ کی تاریخ کا غالباً یہ پہلا موقع تھا جس میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا بیشتر عملہ، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پورا اسٹاف اور ریسرچ انسٹیوٹ پٹنہ کے تمام پروفیسران یکساں دلچسپی کے ساتھ اور مشترک طور پر حق میز بانی ادا کر رہے تھے اور شہر کی منتخب شخصیتیں، ڈاکٹر، وکلا، پروفیسران، اہل علم، صحافی اور نمائندگان پریس رونق بزم تھیں۔

جلسہ کے آغاز کے لئے نو بجے صبح کا وقت متعین تھا۔ لیکن جلسے کی کارروائی ساڑھے بارہ بجے اختتام پزیر ہوئی۔

اس جلسے میں مدرسہ شمس الہدیٰ کے ایک طالب علم تشکیل احمد نے اعلیٰحضرت کی مشہور لغت "لم یات نظیرک فی نظر" پڑھی اور ایک سماں باندھ دیا۔ اس کے بعد پروفیسر اطہر رشید، صدر شعبۂ عربی، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیوٹ نے جلسہ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ مولانا حسن رضا خاں کو تحقیقی مواد اکٹھا کرنے میں کن کن دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑا۔ انھوں نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰحضرت پر کام کرنا جوئے شیر لانے سے کم دقت طلب نہیں تھا، مگر مولانا حسن رضا خاں کو اعلیٰحضرت سے چونکہ والہانہ عقیدت اور جذباتی وابستگی ہے۔ اس لئے وہ خاردار جھاڑیوں سے بھی الجھے، سنگلاخ چٹانوں سے بھی ٹکرائے۔ مگر نہ کبھی آبلہ پائی کا شکوہ کیا، نہ دوریٔ منزل کے احساس سے جبین ہمت پر شکن آنے دی ——— وہ آگے ہی بڑھتے گئے اور بالآخر منزل مراد پر پہنچ کر ہی انھوں نے دم لیا۔ آج کا جلسہ ان کی اس ہمت مردانہ کو داد دینے کی غرض سے طلب کیا گیا ہے اور ہم اپنے انسٹیوٹ اور اسٹاف کی طرف سے ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد خدا بخش لائبریری کے جناب محمود عالم صاحب جو ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مجمع کو مخاطب کیا۔

" مولانا حسن رضا خاں میرے دوست نہیں ہیں ۔۔۔ ہم دونوں کے جذبات و احساسات میں بھی یک رنگی نہیں ہے ۔ ہم دونوں کا مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر بھی الگ الگ ہے ۔ لیکن فکر و نظر کے اس تضاد اور عقیدہ و خیال کی اس نیرنگی کے باوجود میں ان کی قدر کرتا ہوں ۔ کیونکہ مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کرتے وقت عام بریلویوں کی طرح ان کا انداز گفتگو جارحانہ نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔ اعلیٰحضرت میرے مرکز عقیدت ہرگز نہیں ہیں ۔ لیکن میں ان کو ایک ممتاز عالم و فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام شاعر تصور کرتا ہوں ۔ انھوں نے قریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کا کلام " از دل خیزد بر دل ریزد " کا مصداق ہوتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ نعت گوئی میں کوئی ان کا مقابل نہیں ہے ۔ مولانا حسن رضا خاں نے ایسی عظیم شخصیت کو اپنے ریسرچ کا موضوع بنا کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے میں انھیں سچے دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

اس کے بعد سینٹ جیلانی مشن کے جنرل سکریٹری جناب ضیاء جالوی کو دعوت دی گئی ۔ انھوں نے فرمایا ۔ " اعلیٰحضرت دنیائے شعور و آگہی کی ایک بلند قامت شخصیت ہیں اور اپنی علمی کارگذاریوں اور تجدیدی کارناموں کے سبب " مجتہد فی المسائل " وغیرہ القاب کے ساتھ متعارف ہیں ۔۔

اعلیٰحضرت بلاشبہ علوم کے بحر بے پایاں تھے ۔ اور سمندر سے موتی نکالنے کی جرأت وہی کر سکتا ہے جو غواصی اور شناوری دونوں ہی فنون میں ماہر ہو ۔ میں مولانا حسن رضا خاں کی جرأت و ہمت کو آفریں کہتا ہوں جس نے سمندر سے موتی نکال کر ہم نظارگیان دید کے لئے ذوق نظر کی تسکین کا سامان فراہم کیا ۔ مولائے کریم ان کی آرزوؤں کو برومند و جوان کرے ۔۔۔ اور اعلیٰحضرت کے فیوض و برکات سے یہ مالامال ہوتے رہیں ۔ آمین ۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد ۔"

ادارۂ شرعیہ بہار کے قاضی شریعت حضرت مولانا فضل کریم صاحب نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں پیش کئے ۔

" اعلیٰحضرت ایک متبحر عالم تھے ۔ اور متعدد علوم میں انھیں مہارت تھی ۔ ہر فن میں ان کی نگارشات کا ایک بڑا ذخیرہ آج بھی موجود ہے ۔۔۔۔۔

اور ملک اور بیرون ملک کا ان پر کام بھی ہو رہا ہے ۔۔۔۔

مولانا حسن رضا خاں نے ان کی علمی کارگذاریوں کے متنوع اور انکے رنگ برنگ پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے ۔ گویا سمندر سے اس کے صرف ایک قطرے کو اجالے میں لایا گیا ۔۔۔۔

پھر بھی وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نئے اعلیٰحضرت پر تحقیق کرکے دوسرے سکالروں کے لئے کام کرنے کا حوصلہ فراہم کیا ۔

بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سابق کنٹرولر آف اگزامینیشن حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب نے فرمایا ۔ " اعلیٰحضرت ایک فرد ، یا ایک شخصیت کا نام نہیں ہے ۔ اعلیٰحضرت ایک انجمن ، ایک ادارہ بلکہ ایک دائرۃ المعارف ہیں ۔

بجا ہے اگر ان کو ایک مکتبۂ فکر کہئے ۔ درست ہے اگر انکو ایک نظریۂ حیات کہئے ۔ وہ مجمع البحور تھے ۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو تابناک ہے ۔

فقہ پر انھوں نے کام کیا ۔ تفسیر انھوں نے لکھی ۔ فن ہیئت پر ان کی تصنیفات ہیں اور ریاضی میں تو وہ اپنے عہد کے امام ہی تھے ۔۔۔۔ آپ حضرات کی آگہی کے لئے میں یہ بات بتا دوں کہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے سکالر سر ضیاء الدین کو جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر تھے ۔ ریاضی میں ایک ایسی مشکل پیش آئی جس کے کشود کار کے لئے وہ یورپ کا سفر اپنے لئے ناگذیر سمجھ رہے تھے ۔ جب انھوں نے اپنی اس مشکل کا اظہار مسلم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سلیمان اشرف صاحب سے کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ پہلے اعلیٰحضرت سے مل لو ، ممکن ہے مسئلہ کا حل یہیں نکل آئے ۔ ان کی فہمائش پر سر ضیاء الدین صاحب اعلیٰحضرت سے ملے ۔ اعلیٰحضرت نے بات ہی بات میں مسئلہ کا ایسا حل پیش کر دیا جیسے وہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا ۔"

سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "اعلیٰحضرت کا ادب میں وہ مقام ہے جو مقام کم لوگوں کو ملا اور نعت گوئی میں تو کوئی ان کا مقابل ہی نہیں ہے۔ مولانا حسن رضا خاں کو دعائیں دیجئے۔ جنہوں نے رہ نوردان تحقیق کے لئے نئے افق دریافت کئے۔ نئی سمت سفر کی نشاندھی کی۔

خدا کرے کہ مولانا موصوف کی یہ کاوش رہوار سست گام کے لئے مہمیز ثابت ہو۔"

مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل حضرت مولانا سید ابو القاسم صاحب نے فرمایا۔

"اعلیٰحضرت کی عالمانہ جلالت شان اور ان کی علمی کاوشوں کی عظمت و افادیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ان کی تمام نگارشات منظر عام پر لائی جائیں۔ اعلیٰحضرت نے مختلف علوم و فنون پر جس قدر مواد و میٹریلس فراہم کئے ہیں ان ہی کی اگر شیرازہ بندی کر دی جائے تو یہ بھی ایک بڑی بات ہوگی۔

وقت کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اعلیٰحضرت کو لوگ بریلوی مکتبۂ فکر کا صرف ایک مبلغ سمجھتے ہیں اور ان کے معتقدین بھی اپنا سارا زور اعلیٰحضرت کی اسی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوششوں پر صرف کر رہے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر اعلیٰحضرت کے دوسرے محاسن بریلویت کی تہہ میں دب کر رہ گئے۔ لوگوں نے ان کی کتابوں سے صرف نظر کرنا شروع کر دیا اور ملک ان کی تصنیفات سے جس قدر استفادہ کر سکتا تھا نہیں کر سکا، میں مولانا حسن رضا اور بریلوی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد سے گذارش کروں گا کہ وہ اپنی تمام منتشر توانائیوں کو یکجا کر کے ایک مرکز پر آئیں اور سب مل کر اعلیٰحضرت کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت اور ان کے محاسن سے لوگوں کو متعارف کرائیں۔: اعلیٰحضرت کی تمام نگارشات اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کے لئے آپ لوگوں کو اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانی چاہیں۔

عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیوٹ کے پروفیسر جناب سمیع حیدر صاحب نے بھری محفل میں یہ اعتراف کیا کہ "انھوں نے اعلیٰحضرت کی صرف ایک کتاب "فتاویٰ رضویہ" پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اعلیٰحضرت کو ذہین کہنا غلط ہے، وہ تو ایک ذہن ہیں۔ جناب پروفیسر موصوف نے مولانا حسن رضا خاں کی مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں کی گئی کوششوں کو سراہا اور ان کی ہمت و توانائی کو داد دی۔

پروفیسر علی حیدر نیّر صاحب سکریٹری بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اعلیٰحضرت کی عظمت شان اور جلالت علمی کا دیر تک خطبہ پڑھتے رہے۔ اور انھوں نے مولانا حسن رضا خاں کو ڈھیر سی دعائیں دیں اور دیر تک مبارک باد کا تحفہ پیش کرتے رہے۔ ان کی تقریر کے ایک ایک جملہ سے یہ مترشح تھا کہ انھیں اعلیٰحضرت سے نہایت گہری عقیدت ہے اور وہ حسن رضا خاں سے متاثر بھی ہیں۔

اور اب صدر نشین محفل جناب ڈاکٹر فیاض الدین حیدر صاحب، ڈائرکٹر عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیوٹ پٹنہ نے مجمع کو مخاطب کیا۔

"ریسرچ انسٹیوٹ کی تاریخ میں حسن رضا پہلے شخص ہیں جنہوں نے تحقیق کیلئے اتنی جگر کاوی کی ہو۔ ان کی محنت، خلوص اور مستعدی دوسرے طلبہ کیلئے ایک مثال بنے گی۔ میں اپنی اور اپنے انسٹیوٹ کی طرف سے حسن رضا خاں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ یہیں سے اعلیٰحضرت کے زندگی کے کسی اور پہلو پر ریسرچ کر کے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا تعاون کرونگا۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ حسن رضا جیسا مستعد اور حوصلہ مند نوجوان ہمارے ادارہ کا تربیت یافتہ ہے۔"

آخر میں مہمانوں کو نہایت پرتکلف ناشتہ پیش کیا گیا اور چائے پان سے ان کی تواضع کی گئی

میزبانوں کی خوش سلیقگی اور نفاست سے بھی لوگ کافی محظوظ ہوئے

اس کے بعد پروفیسر اطہر رشید صاحب جن کی نگرانی میں مولانا حسن رضا خاں نے ریسرچ مکمل کیا ہے۔ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، پھر محمود صاحب نے جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

[illegible] صاحب فریدی

انصاف کا تقاضا

ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ

وہ بہت حسین تھی ـــــ ایک خاص سانچے میں ڈھلا ڈھلایا جسم ـ شہد ٹپکاتے ہوئے نازک نازک سے ہونٹ ـ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں ـ اور بار حیا سے جھکی ہوئی لانبی لانبی پلکیں ـ

اس کا نام تو کچھ اور تھا مگر ماں باپ نے ہمیشہ پیار سے اسے لاجونتی کہہ کر ہی پکارا تھا ـ

سچ مچ! وہ لاجونتی ہی تو تھی! ــ چھوئی موئی کی طرح بات بات پر شرما جانے والی پیاری سی گڑیا!!

لاجونتی کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی ـ اس کا شوہر ایک خوب صورت ہنس مکھ اور وجیہ نوجوان تھا ـ ذات کا بنیا تھا ـ

ان کی ازدواجی زندگی بہت خوش گوار تھی ـ ایک دن کی بات ہے ـ صبح کا وقت تھا ـ لاجونتی اپنے مکان کے آنگن میں نہا رہی تھی ـ چونکہ گھر میں کوئی اور نہیں تھا ـ اس لئے وہ اطمینان سے غسل کر رہی تھی ـ اچانک اس کے جسم پر پان کا ایک بیڑا آ گرا ـ ہے بھگوان! ـ یہ پان کا بیڑا میرے اوپر کس نے پھینکا؟ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی ـ سر اٹھا کر دیکھا تو ہاتھی پر سوار ایک نوجوان گھر کے قریب سے گزرتا نظر آیا ـ اگرچہ نوجوان کی نظر دوسری طرف تھی مگر لاجونتی کو یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ حرکت اسی شخص کی ہے ـ

اپنی برہنگی کا خیال کر کے، شرم سے پانی پانی ہو گئی وہ جیسے تیسے اشنان ختم کیا اور چارپائی پہ پڑ کر تکئے میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی ـ

وقت گذرتا رہا، وہ روتی رہی اور وقت گذرتا گیا ـ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں ـ پھول سا چہرہ کمہلا گیا ـ اس کا شوہر کہیں باہر گیا ہوا تھا ـ شام کو گھر لوٹا تو اپنی بیوی کا یہ حال دیکھ کر تڑپ اٹھا ـــــــــ

" اری لاجونتی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے تجھے؟؟ کیوں رو رہی ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ لاجونتی ...... لاجونتی .... تو بولتی کیوں نہیں؟ کچھ بول نا ــ تجھے میری قسم!"

لاجونتی نے اپنا سوگوار چہرہ اٹھا کر اپنے من مندر کے دیوتا کی طرف دیکھا اور سسکیوں کے درمیان اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا ـ

" کون تھا وہ شخص"؟ ـــــــــ لاجونتی کے پتی کی مٹھیاں بھنچ گئیں ـ وہ غصے سے کانپ اٹھا ـ باہر نکل کر پڑوسیو سے پوچھا ـــــــــ

" آج صبح کوئی ہاتھی پر چڑھ کے ادھر سے گذرا ہے؟"

" ہاں صبح صبح شہزادہ محمد عالی [illegible] کی سواری ادھر سے گذری تھی "

اچھا تو شہزادہ ادھر سے گذرا ہے
شہزادہ ادھر سے گذرا ہے
شہزادہ ادھر سے گذرا ہے

اس کے دماغ پر ہتھوڑے چل رہے تھے ـ اور وہ

خیالوں کے سیل رواں میں بہتا چلا جارہا تھا ــ کیا کیا جائے ؟ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے ۔ ولیعہد سلطنت کے خلاف ، کون سنے گا ۔ میری فریاد ؟ ــــ شہنشاہ ــــ ! نہیں ۔ نہیں ۔ شیر شاہ لاکھ انصاف دوست سہی مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !! مگر نہیں ــــــ اگر مگر کچھ نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا ناکہ مجھے دھتکار کر دربار سے نکال دیا جائے گا ۔ کوئی بات نہیں ۔ میرے دل کی آگ تو ٹھنڈی ہو جائے گی ۔ کم از کم شہزادہ کو پتہ تو چل جائے گا کہ ہم غریبوں کی بھی عزت ہوتی ہے ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم غریب بھی چاہیں تو ان شہزادوں کو مجمع عام میں ذلیل کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر شہزادہ نے اپنی اس ذلت کا بدلہ لینے کے لئے کوئی قدم اٹھایا تو ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ڈر سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شہزادہ کے ڈر سے میں چپ رہ جاؤں ؟ ۔ ــــــــــ نہیں ــ نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے شہزادہ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا ہی چاہیئے ۔ چاہے جان جائے یا ۔ ۔ ۔ ۔ !

صبح ہوئی ۔ وہ اٹھا ۔ نہا دھو کر دربار شاہی کی طرف روانہ ہو گیا ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ ہندوستان کی باگ ڈور شیر شاہ کے ہاتھ میں تھی ۔ وہی شیر شاہ جس کے متعلق مشہور مورخ کین لکھتا ہے ۔

"اس پٹھان کی حکومت سے جتنی دانشمندی ظاہر ہوتی ہے اتنی کسی بھی دوسری حکومت میں نہیں پائی جاتی ۔ انگریزی دور حکومت میں بھی یہ دانشمندی مفقود ہے ۔"

کہتے ہیں کہ اس نیک دل اور رعایا پرور بادشاہ کے دور حکومت میں روزانہ صبح دربار لگا کرتا تھا ۔ شہنشاہ بذات خود رعایا کا حال سنتے ۔ اور مناسب فیصلے کرتے ۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی ۔ جس کا جی چاہے بادشاہ کے حضور اپنا معاملہ پیش کرے ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ شیر شاہ کو اتنا وقت کہاں سے مل جاتا تھا ! اور اگر اس کے پاس اتنا وقت تھا بھی تو اسے یوں برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی ــــــــ ہمارے آزاد ہندوستان کے ایم ایل اے اور ایم پی صاحبان کو دیکھئے ــــــــ ایک بار جیت کر جاتے ہیں تو پھر کیا مجال کہ پانچ سال سے پہلے جنتا کی خبر بھی لیں ۔ آپ انہیں گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارتے رہیئے ۔ مگر وہ آپ کو وقت دے سکتے ہیں نہ درشن !!!

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے پاس بھاشن کے سوا اور کچھ ہے بھی نہیں ۔ ! وہ آپ کو کیا دیں ، وہ تو خود آپ کے در کے بھکاری ہیں ۔ اس موقعہ پر مجھے ایک دانشور کا قول یاد آرہا ہے ۔ کسی نے اس سے پوچھا تھا ۔ "فقیر اور وزیر میں کیا فرق ہے ؟"

جواب میں اس دانشور نے شاید سچ ہی کہا تھا ــــ ۔ "فقیر صرف نوٹ مانگتے ہیں اور وزیر نوٹ کے ساتھ ساتھ ووٹ بھی !"

بلاشبہ نوٹ اور ووٹ میں بڑا گہرا تعلق ہے ۔ مگر فی الحال اس تعلق پہ بحث کرنے کے بجائے ، ۔ ۔ ۔ ہم یہ دیکھیں کہ شیر شاہ کے دربار میں پہونچ کر اس بنئے پہ کیا گذرتی ہے ۔

وہ بنیا قلعہ معلیٰ کے پھاٹک سے گذر کر بادشاہ کے سامنے جا پہنچا ۔ فریادی باری باری اپنی فریادیں پیش کر رہے تھے ۔ بنیا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ۔ آنے کو تو آ گئے ہیں مگر دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے ۔ کچھ دیر بعد بنئے کا بھی نمبر آ گیا ۔ کانپتا ہوا آگے بڑھا اور شہنشاہ کے سامنے پان کا وہی بیڑا پیش کر دیا ۔ شیر شاہ نے بیڑا ملاحظہ کیا ۔ اور بنئے کی طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا ۔

"مابدولت کچھ سمجھے نہیں ۔ یہ کیسا بیڑا ہے ؟"

بنیا:۔ حضور! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں،،

شہنشاہ:۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے جھجک کہو۔

بنیا:۔ مائی باپ! کیسے کہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے ڈرتا ہوں .... کہیں ....

شہنشاہ:۔ میرے بچے ڈرو نہیں۔ اگر کسی نے تم پر ظلم ڈھایا ہے تو اس کا نام بتاؤ۔ انصاف کی نظر میں سب برابر ہیں۔

بنیا:۔ حضور! میرا مجرم .... میرا مجرم .... شش شہزادہ ......!

شہنشاہ:۔ کیا کہا! شہزادہ عادل؟ کیا عادل نے تمہارے ساتھ کچھ ناانصافی کی ہے؟

بنیا:۔ جی! بادشاہ سلامت!!

شہنشاہ:۔ عادل کو دربار میں حاضر کیا جائے۔

ولیعہد سلطنت شہزادہ عادل دربار میں حاضر ہوتا ہے اور شہنشاہ کے حکم سے بنئے کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ سارے درباری دم بخود ہیں۔

شہنشاہ (بنئے سے مخاطب ہو کر):۔ ہاں اب کہو تمہارے ساتھ عادل نے کیا کیا ہے۔؟

بنیا:۔ خداوند نعمت! میری بیوی کل صبح اپنے گھر کے آنگن میں نہا رہی تھی اچانک ادھر سے شہزادہ محترم کی سواری گذری۔ انھوں نے .... انھوں نے ....

میری بیوی کو نہاتے دیکھ کر .... پان کا بیڑا اس پر پھینک دیا۔ وہ بیچاری شرم سے زمین میں گڑ گئی تب سے .... تب سے .... رو رو کر جان کھو رہی ہے .... حضور ....

مائی باپ ...... میں شہزادہ کی شکایت کبھی نہ کرتا ... مگر .... مائی باپ ...... مجھ سے اس بیچاری کا رونا دھونا دیکھا نہیں جاتا .... جہاں پناہ۔

میں نے اسے وچن دیا تھا .... اس سے کہا تھا کہ میں اس کی شکایت جہاں پناہ سے کروں گا ....

اسی لئے ...... اسی لئے مائی باپ ...... میں یہاں تک آ گیا ...... اسی لئے ......

شہنشاہ:۔ تم نے بڑا اچھا کیا کہ یہاں تک آ گئے۔ انصاف کی عدالت میں راجہ اور رنک سب برابر ہیں۔ مجرم کو بہر حال سزا ملنی ہی چاہیئے۔ خواہ وہ بادشاہ کا بیٹا کیوں نہ ہو۔

عادل! تم بتاؤ کیا بنئے کا بیان درست ہے؟

عادل:۔ جہاں پناہ! بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا گواہ ہے میں نے محض اس لئے اس کی بیوی پر پان کا بیڑا پھینکا تھا تاکہ آئندہ غسل کرتے وقت وہ پردے کا خیال رکھے اور یوں آزادانہ ڈھنگ سے نہانے سے پرہیز کرے۔

عالی جاہ! میری نیت پر شبہ نہ کیا جائے۔

شہنشاہ:۔ دنیا نیت کو نہیں، عمل کو دیکھتی ہے۔ ممکن ہے تمہاری نیت اچھی رہی ہو مگر حرکت اچھی نہیں۔

عادل:۔ مجھے افسوس ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

شہنشاہ:۔ معافی! نہیں عادل!! مجرم معافی کے نہیں، سزا کے حقدار ہوا کرتے ہیں۔ از روئے انصاف میں حکم دیتا ہوں کہ مجرم عادل کی بیوی، اس بنئے کے آنگن میں ٹھیک اسی جگہ اسی طرح غسل کرے جس طرح کہ اس بنئے کی بیوی غسل کر رہی تھی اور یہ بنیا ہاتھی پر بیٹھ کر اپنے گھر کے قریب سے گذرے اور گذرتے وقت پان کا یہ بیڑا مجرم عادل کی بیوی پر پھینک کر اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے۔

عادل:۔ عالی جاہ! میری بیوی بے قصور ہے۔ اس پر رحم کیا جائے۔ جرم میں نے کیا ہے۔ سزا بھی مجھے دی جائے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں مگر ....

اس بیچاری کو یوں بے عزت نہ کیا جائے ....

عالی جاہ! وہ مر جائے گی ....

..... وہ مر جائے گی۔

شہنشاہ:۔ اس بنئے کی بیوی بھی مر رہی ہے عادل! اس بنئے کی بیوی بھی غیرت سے مری جا رہی ہے۔ اسے زندگی چاہیئے.......

عادل:۔ میں جہاں پناہ سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔

شہنشاہ:۔ ظالم پہ رحم کرنا، مظلوم پہ ظلم ہے۔

عادل:۔ جہاں پناہ! اگر صرف میرا معاملہ ہوتا تو میں خاموش رہ جاتا مگر عالی جاہ! میری بیوی اس ملک کے محبوب بادشاہ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ جہاں پناہ! وہ آپ کی بہو ہے اس ملک کی، اس تخت کی آبرو ہے۔ اس کی عزت کو خاک میں نہ ملایئے۔ جہاں پناہ! اس کی عزت کو خاک میں نہ ملایئے......... ورنہ شاہی گھرانہ بے عزت ہو جائے گا......

شہنشاہ:۔ وہ جھوٹی عزت کس کام کی، جو اپنے ضمیر کو بیچ کر خریدی جائے۔ شاہی گھرانے کی عزت کو بچانے کے لئے، میں انصاف کے تقاضوں کا خون نہیں کر سکتا عادل!.....

..... میں انصاف کے تقاضوں کا خون نہیں کر سکتا۔

عادل:۔ آہ آج میرا کلیجہ خون ہو رہا ہے۔ کاش میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا!!

شہنشاہ:۔ تم تو اسی دن، اسی وقت مر گئے تھے عادل! جب تم نے ایک بنئے کی عزت پر بری نظر ڈالی تھی۔ اس وقت تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر کوئی تمہاری عزت سے کھیلنے کی کوشش کرے تو تم پہ کیا گذرے گی۔ اب میں اس سلسلہ میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

بنیا:۔ جہاں پناہ! مجھے اپنا انصاف مل گیا۔ مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیئے۔ میں نے شہزادہ کو معاف کیا۔ بھگوان انہیں معاف کرے۔

یہ سن کر شہزادہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے بنئے کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ میرے بھائی آج تم نے میری عزت بچالی۔ آج سے تمہاری عزت میری عزت ہے۔ تمہاری بیوی میری بہن ہے۔ تم دونوں کے لئے حکومت کے خزانے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بقیہ صفحہ ۲۲ سے آگے

کر توفیق باندازہ ہمت ملتی ہے اور آدمی بقدر حوصلہ و ظرف ہی فیضیاب ہوتا ہے۔ سچ کہا ہے جس نے بھی کہا ہے ؎

یہ تو اپنا اپنا ہے حوصلہ، یہ تو اپنی اپنی اڑان ہے
کوئی اڑ کے رہ گیا بام تک کوئی کہکشاں سے گذر گیا

آج میں آپ کی بارگاہ عظمت و جلال میں عقیدت کے چند پھول لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس آپ کے حضور میں نذر گذارنے کے لئے اور رہ ہی کیا گیا ہے ؎

کیا نذر کروں تم کو کیا چیز ہماری ہے
یہ دل بھی تمہارا ہے یہ جاں بھی تمہاری ہے

میرے آقا! آپ ولایت کی اس منتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ جس کے بعد کوئی منتہا نہیں ہے۔ بارگاہ الٰہی سے آپ کو محبوبیت خاص کا طغرائے امتیاز عطا ہوا ہے۔ آپ غوثیت عظمیٰ کے مقام رفیع پر فائز ہیں۔ اور بقول سرکار آسی آپ نبوت کے سوا ہر فضیلت کے جامع ہیں ؎

پوچھتے ہو شہ جیلاں کے فضائل آسی؟
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

نعت شریف

از- حیرت گونڈوی

• مرا بیڑا ابھی طوفان بلا سے پار ہو جائے
اشارہ چشم رحمت کا اگر سرکار ہو جائے

• فدا اُس آنکھ پر ہو گلشنِ جنت کی رعنائی
جسے اللہ کے محبوب کا دیدار ہو جائے

• وہ سرکار دو عالم ہیں جو رحمت کی نظر کر دیں
تو مجبورِ زمانہ وقت کا مختار ہو جائے

• نفس کی آمد و شد منحصر ہے ان کی رحمت پر
نظر وہ پھیر لیں تو زندگی بے کار ہو جائے

• چلے سوئے مدینہ سر کے بل حیرت مسرت میں
اُسے گر حاضری کا حکم اے سرکار ہو جائے

ہم لوگ

صابر القادری نسیم بستوی

پیامِ نور سرِ رہگذار ہیں ہم لوگ
فضائے لالہ وگل کی بہار ہیں ہم لوگ

جہاں کا درد لئے بیقرار ہیں ہم لوگ
دیار عشق کے نقش ونگار ہیں ہم لوگ

خیال قلت وکثرت کا کوئی اور کرے
بہ شان عزم جواں بیشمار ہیں ہم لوگ

بڑھے تو موجِ حوادث کا رخ بدل ڈالا
بنائے گردش لیل ونہار ہیں ہم لوگ

ہماری عظمت وسطوت غبار راہ نہیں
ازل سے فخر جہاں تاجدار ہیں ہم لوگ

روش روش پہ فروغ بہار تو لے کر
خزاں کی گود میں بھی نغمہ بار ہیں ہم لوگ

مٹائی رسمِ جہالت ہمیں نے دنیا سے
بفیض علم ویقیں شاہکار ہیں ہم لوگ

بلند پرچم صلح وصفا رہے گا نسیم
وفا پسند حقیقت شعار ہیں ہم لوگ

رفیق ادارہ مولانا ضیاء جالوی

سیدنا عبدالقادر جیلانی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

آج میں ایک ایسی توانا اور قد آور شخصیت کے حضور نذرانہ عقیدت لے کر حاضر ہو رہا ہوں جس کی عبقریت کے آستانے پر ہر زمانہ میں سجود نیاز لٹائے گئے۔ جس کی شوکت اقتدار کا پرچم چار دانگ عالم میں آج بھی لہرا رہا ہے۔ جو ۴۷۱ھ میں رمضان المبارک کی ایک ارجمند ساعت میں گیلان کے آسمان پر نیر درخشاں بن کر طلوع ہوئی اور اس نے اپنی تابناک کرنوں سے از افق تا بہ افق اجالا کر دیا۔

جس کے نقوش قدم رہروان جادۂ محبت کے لئے آج بھی نشان راہ اور گم کردگان راہ ہدایت کے لئے ہر زمانہ میں منزل مراد ہیں۔ جس نے عروس حیات کی برہم زلفوں کو سنوارا اور خود حیات کو لذت حیات سے آشنا کیا۔ پانچویں صدی ہجری میں باطنیوں کی دہشت انگیزیوں کے نتیجے میں جب زندگی دھماکہ خیز ہو گئی تھی، تو آپ ہی کی کوششوں سے نارمل ہوئی۔ آپ ہی نے زندگی کی اس نہج سے تعمیر و تہذیب کی، اس طرح اسے منظم کیا کہ وہ جرأت آموز بھی ہو گئی اور جرأت آزما بھی!

آپ ہی نے زندگی کے لئے نئے افق دریافت کئے۔ نئی سمت سفر متعین کی اور اس کے وسیع امکانات کے پیش نظر کے حدود اختیارات کی وضاحت کی۔

یونانی فلسفہ الٰہیات کے زیر اثر جب عقائد و اعمال کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اور قوائے عمل اور اذہان براہ راست متاثر ہونے لگے۔ جب منافقین بھیس بدل بدل کر مسلم معاشرے میں در آنے لگے۔ کبھی خارجی بن کر، کبھی باطنیوں کا بہروپ اختیار کرتے، کبھی معتزلہ، جبریہ اور قدریہ کا لبادہ اوڑھ کر، جس کے نتیجے میں اُمّت مسلم مختلف فرقوں میں منقسم ہو گئی ـــــــــــ ایسے وقت میں جو شخص "قلندرانہ اداؤں سکندرانہ جلال" کے ساتھ میدان کارزار میں آیا، وہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔ آپ نے تمام اسلام دشمن فرقوں کو ایک ایک کر کے برافگندہ نقاب کیا۔ آپ ہی نے معتزلہ جیسی بیگانہ مذہب فرقہ کی افتراق انگیز منصوبہ بندی اور ان کی ایمان و عقیدے کو ڈائنامیٹ کرنے والی سازش سے خبردار و متنبہ کیا۔ آپ ہی نے باطنی فرقہ کی اسلام دشمنی کا راز طشت از بام کیا۔ آپ ہی نے فلسفوں کی اس مجرمانہ ذہنیت کا انکشاف فرمایا کہ وہ کس طرح مسلمانوں کو شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنسا کر دین و مذہب سے منحرف کر دینا چاہتے ہیں۔ کس طرح وہ ایمان و عقاید پر چاند ماری کر کے اور امت کے بیدار مغز و بالغ نظر افراد کو دور از کار فلسفیانہ مباحث میں الجھا کر عمل سے فارغ کر دینا چاہ رہے ہیں۔ غرض آپ نے کتاب ملت بیضا کی نئے سرے سے شیرازہ بندی کی اور نخل اسلام کو ان تمام جھاڑ جھنکاڑ، اجنبی اور بیگانہ پودوں سے پاک و

ساف کیا جو نخل اسلام کے آس پاس از خود اگ آئے تھے۔ اور
نخل اسلام ہی کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ اسی کے حصہ
کی غذا پر جی رہے تھے۔ اور اسی کے حصہ کی ہوا پانی پر ان کی ساجھے
داری تھی۔ اس لئے نخل اسلام کی نشو و نما لازمی طور پر رک سی
گئی تھی۔ اس کے پھول مرجھانے سے لگے تھے۔ اور اس کی ڈالیاں
پیرہن برگ سے عریاں ہو چلی تھیں۔ ایسی صورت میں ایک فرض
شناس مالی کی طرح اگر خود رو پودوں کو آپ اکھاڑ نہیں پھینکتے تو
نخل اسلام کب کا پیوند زمین ہو گیا ہوتا ــــ اگر آپ نے جسم ملت
کے رِستے ہوئے ناسور پر نشتر زنی کر کے جمع شدہ فاسد مادوں
کو نہیں نکال پھینکا ہوتا تو جسم میں صحت مند اور صالح خون کی تولید
ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

کفر و الحاد کی بڑھتی ہوئی یلغار اور ذہنی و فکری آوارگی کے
قیامت آشوب دور میں فتنہ پرور ٹولیوں کا مقابلہ آسان نہ
تھا۔ لیکن آپ نے حالات کی ناسازگاری اور زمانہ کے بگڑتے
ہوئے تیور کی پرواہ کئے بغیر آپ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ
میدان عمل میں کود پڑے اور قلم کے محاذ پر آپ نے ان تمام
فرقوں سے نبرد آزمائی کی جو اسلام کی تسلیم شدہ حقیقتوں کو سبوتاژ
کر رہے تھے۔ آپ نے شجر اسلام کی شادابی واپس لانے کے
لئے اپنی رگ حیات کا ایک ایک قطرہ خون اس کی جڑوں میں
نچوڑ دیا۔ آپ نے ملت کی منتشر توانائیوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کے
لئے اپنی پوری زندگی داؤں پر لگا دی ہے

زمانہ مانگنے آیا تھا روشنی کی بھیک
ہم اپنا گھر نہ جلاتے تو اور کیا کرتے

اور اس طرح جان جوکھوں میں ڈال کر آپ نے ملت کو
افتخار و سربلندی اور دین کو حیات نو عطا کیا۔ اسی بنا پر دنیا آپ
کو محی الدین کے معزز لقب سے یاد کرتی ہے۔

یا شیخ عبد القادر جیلانی، اے دین کو حیات نو عطا
کرنے والے آقا! آج ملت کو پھر آپ کی ضرورت ہے۔ آج
امت مرحومہ پھر آپس ہی میں دست بگریباں ہے۔ آج پھر
مختلف ٹولیوں میں بٹ رہی ہے۔ آج پھر آیات قرآنیہ کی من مانی
تفسیر اور الٹی سیدھی تاویلیں کی جا رہی ہیں۔ آج پھر مذہب
کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کرنے کا چلن عام ہو رہا ہے۔
آج پھر اپنے ہی لوگ حرمت اسلام کی غارت گری پر تل گئے ہیں
آج پھر دین میں سودے بازی ہو رہی ہے۔ آج پھر مذہب کا
استحصال کیا جا رہا ہے۔ آج پھر دینی بے تعلقی اور مذہب بیزاری
بڑھ رہی ہے!۔

آج پھر مسلمان غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ہاں،
ہاں! آج پھر جیب و گریبان کا ایک تار بھی سلامت نہیں ہے
گلوں کے پیرہن کو آج پھر حاجت رفو ہے۔ پھولوں کی قبا آج
پھر چاک چاک ہے۔ لالہ کے کلیجے میں آج بھی داغ ہے۔ نرگس
کی آنکھ آج بھی بصارت کو رو رہی ہے۔ صحرا کے بگولے آج بھی
خاک بسر ہیں۔ سمندر کی موجوں کو ساحل سے سر پھوڑتے آج
بھی میں نے دیکھا ہے۔

کشتی ملت کے ناخدا! ملت کی ٹوٹی ہوئی کشتی کو منجدھار
سے نکالئے۔ اے چارہ ساز دردمندان، اے
مسیحائے زماں! خستہ و بیمار دلوں کی خبر لیجئے۔ کہ جراحت دل کا
اندمال آپ ہی کے شفاخانے میں ہے۔

پہلے بھی رہوار سست گام کو آپ ہی نے مہمیز کیا تھا۔ اور آپ
ہی کی رہبری میں خستگان راہ منزل مراد تک پہنچے تھے۔ پہلے بھی آپ ہی
نے غرق معصیت افراد کی اصلاح و تربیت پر توجہ صرف کی تھی۔ اور
آپ ہی کی نظر کیمیا اثر سے جنم جنم کے پاپی جنید وقت اور بایزید عصر
ہو گئے تھے۔ پہلے بھی تشنگان معرفت آپ ہی کے دریائے فیض سے
سیراب ہوئے تھے۔ آپ ہی نے خم کا خم لنڈھایا تھا، جام پر جام بخش
کئے تھے۔ جس نے قطرہ مانگا تھا، اسے دریا بخش دیا تھا۔ جس
نے درد تہہ جام ہی کی آرزو کی وہ آپ کی کرم گستری سے میکدہ بردوش
ہو گیا۔ آپ کی نظر جس سمت اٹھ گئی تھی، کیفیتوں کا ایک سیلاب
انڈیل گئی تھی۔ جس آدمی کو نظر بھر آپ نے دیکھ لیا تھا وہ مست
مئے الست ہو گیا تھا ـــــــ یہ دوسری بات ہے

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

حضرت ندیم گورکھپوری۔ آسنسول۔

نجد سے سہارنپور تک (ایک مطالعہ)

"نجد سے سہارنپور تک" مولانا محمد میاں کامل سہسرامی کی ایک گرانقدر تصنیف ہے جو ماہنامہ پاسبان میں قسط وار شائع ہوئے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔

"نجد سے سہارنپور تک" نہ تو کوئی ناولٹ ہے اور نہ ہی افسانوں کا مجموعہ [illegible] مزاح، چٹکیوں اور اٹکھیلوں سے بھرپور ایک کتاب ہے جو [illegible] مذہب یعنی ایوان دیوبندیت پر ظرافت کے [illegible] ایک عمل حملہ ہے ساتھ ہی اس کے غلط عقائد کی نقاب کشائی بھی ہے۔!

[illegible] سبب تالیف یوں بیان کرتے ہیں "میں نے [illegible] جس چراغ کو روشن کیا تھا، حوادثات زمانہ سے [illegible] مدھم ہو گئی مگر جو روشنی پھیل چکی ہے اس کی تابانی [illegible] کی بات ہے جب کہ پاسبان سے کلیتہً [illegible] تھا۔ "نجد سے سہارنپور تک" —— [illegible] فاضل جلیل مولانا محمد میاں کامل پر گئی [illegible] کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے وہ ہچکچائے لیکن [illegible] —— وہ تیار ہی نہیں ہوئے بلکہ ایسے [illegible] ہوئے، گویا ایوان دیوبندیت کے لئے مدتوں سے [illegible] لئے بیٹھے ہیں۔ صرف اس کا انتظار تھا [illegible] کو لے کر آگے بڑھے —— چنانچہ [illegible] کہ میں پورا ملک گونج اٹھا۔ ہر طرف سے تحسین [illegible] بلند ہوئی"۔!

[illegible] "نجد سے سہارنپور تک" کے پیمانے میں تولتے ہوئے مولانا کامل میاں کا وزن اس طرح متعین فرماتے ہیں —— "نجد سے سہارنپور .... سنجیدہ مزاح علمی و معلوماتی ظرافت کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے مولانا کامل اپنے اس طرز نگارش میں بالکل یگانہ و منفرد ہیں —— بات میں بات پیدا کرنا اور ہنستے بولتے ایسی دور رس باتیں کہہ جانا، جہاں خواص ہی کا ذہن جاسکے یہ ان کا خاص فن ہے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ جس نے انھیں دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے ——!!

اردو کے طنز و مزاح نگاروں میں مرحوم جلیس، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، خواجہ عبد الغفور وغیرہ قابل ذکر ہستیاں ہیں۔ اگر ان مزاح نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں مرحوم جلیس کی طنز نگاری اور اسلوب بیان سب سے الگ پایا جائے گا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جلیس کی طنز نگاری حقیقت سے زیادہ قریب ہے، یعنی یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ افسانوی دنیا میں جو مقام پریم چند اور منٹو کو حاصل ہے طنز و مزاح نگاری میں وہی مقام جلیس کا ہے۔

شوکت تھانوی ابراہیم جلیس، خواجہ عبد الغفور، فکر تونسوی اور مولانا کامل سہسرامی کی طنز نگاری کا سرسری جائزہ کے بجائے اگر تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ مولانا کامل نے طنز و مزاح نگاری کو ایک نئی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ان کا طرز نگارش طنز و مزاح کی آخری حد کو چھو رہا ہوتا ہے۔

کامل سہسرامی کا انداز بیان شوکت تھانوی سے کافی

ملتا جلتا ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ شوکت تھانوی کی طنز اور کامل سہرامی کا مزاح دونوں سگے بھائی بہن ہیں۔ مگر شوکت سے کہیں زیادہ جلیس کا فن حقیقت سے قریب ہے اور مولانا کامل سہرامی کی صداقت پسندی تو جلیس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی ہے ۔

اردو کی ترویج و اشاعت اور زبان کو سنوارنے میں مولوی اور صوفیوں نے کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، مگر بالائے ستم کہ ہمارے ناقدین، محققین اور ماہرین لسانیات انھیں صرف مولوی سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں ۔

اگر تاریخ ادب اردو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ مولوی اور صوفیوں نے اردو زبان میں اس وقت طبع آزمائی کی جب اردو زبان در حقیقت اپنا کوئی مستقل نام بھی نہ رکھتی تھی اسی سلسلے میں ہم خواجہ نظام الدین اولیا، رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عزیز مرید اور صوفی شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے پہلے پیش کرتے ہیں ۔

پروفیسر طاہر رقم طراز ہیں ——— "جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس نئی اور عام فہم زبان نے ترقی کرنی شروع کی، یہاں تک کہ تیرھویں عیسوی یعنی پٹھان بادشاہوں کے عہد میں امیر خسرو دہلوی نے سب سے پہلے ادبی اغراض سے اس مخلوط زبان کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیا ورنہ اس کے قبل لکھنے پڑھنے میں مطلقاً اس زبان کو دخل نہ تھا۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے اس زبان میں جو حقیقتاً اپنا کوئی مستقل نام بھی نہ رکھتی تھی، شعر کہا ۔ اور پہیلیاں مکرانیاں اور دو سخنیں وغیرہ جیسی تمام چیزیں نظم کرنا شروع کیں ۔"

اسی طرح مولانا الطاف حسین حالی، حکیم مومن خان مومن، اکبر الہ آبادی، اور امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی وغیرہ کی ادبی خدمات سے کون ہے جو متعارف نہیں ۔

اردو نثر نگاری کے میدان میں بھی مولوی اور ملاؤں نے پہل کی ——— سید محمد حسینی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اردو کے پہلے نثار ہیں یہ اور بات ہے کہ انھیں اردو کا پہلا نثار تسلیم نہ کیا گیا۔ ان کی زبان اور اسلوب و بیان دیکھئے ———

کہے، تحقیق خدا کے سیانے ستر ہزار پردے وجیالے، ہو مانڈیا رہے کے، اگر اس میں تے یک پردہ جاوے تو اس کی آنچ تے ہیں جلوں ع ہوا ایک وقت ایسا ہوتا ہے، بجھو اور دیکھو بے پردہ اندھارے کے، وجیالے کے عارفان پر ہے ——— دے واصلاں پر پردے نورانی دے واصلاں کا صفا پردہ ہوتا ہے، سو محمد کا نور ہے عزیز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (معراج نامہ بندہ نواز)

ان کی وفات کے چوہتر سال بعد ۱۴۹۶ء بعہد بہمنی اردو کا ایک اور نثار شاہ میران جی کے نام سے دکن میں جنم لیتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر زور کا قول ملاحظہ ہو ———

" شاہ میران جی حضرت خواجہ بندہ نواز ہی کے سلسلہ صوفیاء میں سے ہیں، انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اردو ہی میں تعلیم و تلقین کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی کام کیا، انھوں نے بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہیں ۔ شاہ میران جی کی کئی نظمیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اس وقت تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام بہت مقبول تھا ۔ اور دور دور تک اس کی نقلیں پہنچ گئی تھیں" ——— اسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں

——— " میران جی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے "شرح مرغوب القلوب" ان کا لکھا ہوا ایک رسالہ نثر میں ہے، جس میں دس باب ہیں۔ ہر باب آیت قرآنی یا حدیث سے شروع کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور مختصر شرح کرتے ہیں ۔"

نمونے کے طور پر یہ اقتباس پیش کرتے ہیں ———

——— "پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جسے کوئی پوچھتا ہے انوکیاں توڑ کر انو تھے ۔ تن سن ہور جیب نکو اچہ اس چار پاتاں کا بند ہے یوں شریعت میں پہلے پاؤں رکھ کر طریقت شریعت منبع ہے"۔ پیغمبر کہے کہ جو کچھ کام کرنے کا کوئی خدا کا قانون نالے کر تو او کام پائمال ہوگا۔ سر انا نواز نا خدا کوں بہت کم اوپالن ہار ہے عالم کا۔

(دکنی ادب کی تاریخ، مولفہ ڈاکٹر زور ص ۲۲)

لیکن ان کی بھی نثری تخلیقات شرف قبولیت کا تاج پہن نہ سکیں ـــــ ایک زمانہ کے بعد دکن میں ایک اور شاعر و نثار ملا وجہی کے نام سے ابھرا، اس کی شعری اور نثری دونوں تخلیقات مقبول عام ہیں ـــــــــــ غالباً اردو نثر کی پہلی کتاب وجہی کی "سب رس" کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں پہلی اردو نثر "دہ مجلس" مولف فضلی بعہد محمد شاہ منظر عام پر آئی اس کے بعد شمالی ہند کی ایک اور نثری کتاب مولف تحسین لکھنوی بعہد نواب شجاع الدولہ منظر عام پر آئی۔ غالباً اردو نثر کی یہی دو کتابیں شمالی ہند کی اولین یادگار ہیں۔ جنھیں قبولیت عامہ حاصل ہے اس کے بعد مشرقی ہند میں فورٹ ولیم کی تصنیفات کا دور شروع ہوتا ہے، فورٹ ولیم نے اپنے مختصر زمانے میں اردو میں جو لٹریچرس پیدا کئے وہ بے نظیر ہیں۔ فورٹ ولیم کی تصنیفات میں میرامن کی "باغ وبہار" کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی ـــــ

میرامن کی "باغ وبہار" اردو کی زندہ نثر سمجھی جاتی ہے بعد میں محمد حسین آزاد نے "فسانہ عجائب" لکھ کر اردو نثر کو ایک منفرد اسلوب وبیان دیا جو آج بھی رائج ہے" ـــــ

اسی طرح مولانا کامل سہرامی نے اردو کے طنز ومزاح نگاری کی روایت کو چھلانگ کر طنز ومزاح نگاری کے اصل مفہوم کو سمجھا ـــــ ان کی تصنیف "نجد سے سہاران پور تک" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وہ اپنی کتاب کا انتساب مدیر پاسبان کے نام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ـ

"مدیر پاسبان کی اس تحریک کے نام ـــــ جس نے میرے قلم کو نجد کے ریگستان میں بگٹٹ دوڑنے پر مجبور کیا ـــــ" اس انتساب کو دیکھ کر ہی قارئین ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی مزاح نگاری کے قائل ہو جاتے ہیں ـــ

زبان وبیان کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی اگرچہ اس میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے الفاظ کی بھی آمیزش ہے مگر فاضل مصنف کا انداز بیان کچھ ایسا آراستہ پیراستہ ہے کہ عام وخاص کی سمجھ میں بآسانی آجاتی ہے ـــــ مولانا کامل سہرامی داستاں کی ابتدا یوں کرتے ہیں ـــــ

ـــــ "جرمن کا فلسفی جھوٹ کہیں جا ہے جو کچھ بھی کہا ہو لیکن صحرائے نجد کے ایک افلاطون قسم کے منطقی کا مقولہ ضرور سن لیجئے، اگر سماعت نازک ہوگئی ہو تو میرے راہ راست پر آنے کی دعا کیجئے، لیکن سن ضرور لیجئے"۔

"ہمیشہ اتنے بھیانک قسم کا سچ بولو کر پوری انسانی آبادی چونک اٹھے اور دنیا کی ساری سچائی، ٹھوس واقعات، تاریخی صداقتیں خودکشی کرلیں ـــــ"

یہ ایسی تمہید ہے کہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا کامل کے مزاج میں ہی فصاحت وبلاغت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس کے علاوہ ان کی زبان وبیان پر اچھی طرح گرفت تھی، اور ان کے پاس الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود تھا کہ عقل سلیم حیران رہ جاتی ہے۔

حضرت کامل سہرامی کو صرف ایک اردو زبان پر ہی ملکہ حاصل نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور عربی الفاظ ومحاورات کا بڑی خوبی سے استعمال فرماتے تھے۔ یہ اقتباس میرے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہے ـــــــــ "میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ایڈیٹر پاسبان صلح کلی قسم کے سنی ہیں۔ مومنین کاملین صادقین کی صف میں ان کا نام ہرگز نہیں آتا۔ لیکن اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑتا قہر درویش برجان درویش"۔ صبر کئے ان مبارک عین تبارک دن کا منتظر تھا۔ جب ان کا بھانڈا نیچ چوراہے پر پھوٹے اور ان کے غرور کا سر ٹوٹے۔

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْن۔

کل صبر کا پھل مل گیا صوفی چقندر شاہ نے بات بات میں آخر کہہ ہی دیا کہ "پاسبان والے مشتاق میاں صلح کلی ندوی ہیں ـــــ"

مولانا کامل سہرامی کی نثر نگاری انتہائی سادہ اور سلیس ہے محاورات تشبیہات اور استعارات کا جابجا استعمال موسیقیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے داستان گوئی کے معاملہ میں فاضل مصنف کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ زبان و بیان کی ساری خوبیاں مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتی ہیں ——— "کانگریس ملک کی کتنی ہی مقبول جماعت ہو۔ کیسی ہی حکمرانی کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن یقین فرمائیے کہ جب کوئی لانبی داڑھی والا کھدرپوش ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہ مولوی رہتا ہے نہ کانگریسی بلکہ دونوں کے درمیان کی چیز چھو ٹو مداری (عرف چالباز شکاری) بن جاتا ہے جو اتنی مہارت و ہوشیاری سے جال ڈالتا ہے کہ غریب شکار کو پھر پھڑانے تک کا موقعہ نصیب نہیں ہوتا۔ بھانومتی کے پٹارے کا ایسا ایسا کرتب دکھائے گا کہ بس دیکھا کیجئے ——— ہاتھ کی صفائی ایسی کہ کتنے مداریوں نے تو شرما کر اپنا کام دھندا چھوڑ دیا ———"

صوفی صاحب حضرت شیخ کے خاص بلکہ خاص الخاص عقیدت مندوں میں ہیں۔ جب کبھی شیخ کا ذکر آیا ان کی آنکھوں سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے نکل پڑے۔ پیر صاحب کی تقلید میں ہمیشہ کھدر پہنتے ہیں پائجامہ اتنا محتاط کہ بس گھٹنوں سے ذرا سا نیچے رہتا ہے، دور سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ نئے فیشن کی ہاف پینٹ ہے، کرتے کی لمبائی ہمیشہ جبے کے دھوکے میں ڈالتی ہے، سیاہ چمکتا ہوا چہرہ اس پر ڈیڑھ بالشت کی دودھ جیسی سفید داڑھی، گویا صبح و شام کا سنگم، لوگوں کو ہمیشہ قرآن و حدیث پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں ———"

——— "ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ رسول دشمنی ہے یا اپنے بزرگوں کی غلط عقیدت مندی کا غلط نتیجہ، آخر جب بات آپ کے گھر کی ہوتی ہے تو کیوں منہ میں دہی جم جاتا ہے اور رسالت کا معاملہ ہوتا ہے تو زبان و قلم دونوں اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل پڑتے ہیں ———"

فاضل مصنف ایک اچھے ظریف اور بلند درجہ انشاپرداز ہونے کے ساتھ ایک جگہ نقاد کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں ——— "کتاب لیکر اوپر سے دیکھا نیچے سے دیکھا لیکن خاک سمجھ میں نہ آیا، اول تو کتاب کے سرورق پر مختلف قسم کے موٹے موٹے عنوانات اور پھر عربی کے جملے "ترجمہ بھی ایسا کہ مجھ جیسا پرائمری پاس انسان زندگی بھر نہ سمجھ سکے۔ سب سے موٹے عنوان کے ترجمے کا پہلا لفظ تھا۔ "علماؤں"، قائدہ بغدادی سے لیکر پرائمری تک کی ایک ایک کتاب کو دیکھ ڈالا لیکن کہیں نہ ملا کہ "علماؤں" واحد ہے کہ جمع ———"

اسی طرح "غدار بے باک عالم"، پر موصوف کا تنقیدی نظریہ ملاحظہ فرمائیے ———"

"پوری کتاب مدیر پاسبان کی منقبت کا سدا بہار گلدستہ ہے، جس جملے پر نظر پڑتی ہے، ایک نئی خوشبو محسوس ہوتی ہے کہیں گلاب، کہیں موتیا، کہیں بیلا ہے کہیں چمیلی کہیں چمپا ہے کہیں موگرا۔ میری قوت شامہ تو بالکل الٹی ہو گئی ہے۔ اس لئے ہر ہر جملے پر ناک پر رومال رکھنا پڑا کہیں کہیں متلی بھی آئی۔ اگر آپ کی قوت شامہ صحیح ہو تو چند جملوں کی خوشبو لے جانفزا سے مشام روح کو معطر کیجئے ———" آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ ——— "زبان و ادب کے اعتبار سے تو ایسی ہے کہ بس نثر میں شاعری ہی شاعری ہے، بچا غالب بھی قبر کے اندر طبلہ بجاتے ہوں گے۔ ملاحظہ ہو ———" جو جواب بھیجا عواموں کی دانست میں چھاپ کر شائع کرتا رہتا ہے" ——— "بے امتیازی کی بندش میں غرق رہا کرتا ہے" ——— "مئے جام خمار جوش زدگی" ——— "لفظ خفیہ متعدد جگہ "خونیہ"۔ تحریر فرمایا گیا ہے"۔

لعنۃ اللہ علی الکاذبین"۔ الصلحۃ الکلیۃ"۔

یعنی اخیر کا لفظ بھی آیت کا جز ہے"۔

"مبلغ علم ہے اس ذات گرامی کے خلیفہ کا جس کا نام نامی ہمیشہ دو چار سطروں میں لکھا جاتا ہے۔ اور اس علم پر ہمت یہ کہ سارے علمائے اہلسنت کو للکار رہا ہے۔ چنانچہ اخیر میں درج ہے

——— "اگر چھیڑ چھاڑ کی ٹھہری تو اس سے بھی زیادہ وضاحت ممکن ہے" ———!

یعنی یہ کوئی سنجیدہ اعتراض نہیں بلکہ چھیڑ چھاڑ ہے ———
اب اس چھیڑ خوانی پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ جب اللہ گدھا بنائے تو دو سینگ بھی عنایت کر دے"———

※

اس کتاب کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فاضل مصنف نے جو اشعار ترتیب دیئے ہیں ان کا خالق کوئی اور ہے مگر سہرا کسی اور کے سر رکھتے ہیں۔ ایک جگہ آپ نے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر نقل کیا ہے مگر شیخ سعدی کے نام منسوب کرتے ہیں———

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتے بھی نہیں،
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

اسی طرح موصوف نے ایک جگہ ۵ اشعار پر مشتمل ایک منظوم "ڈرکس کا ہے"، پیش کیا ہے اور اس کی نسبت مرزا غالب سے جوڑی گئی ہے جو غالب کی نظم سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی تخلیق ہے ہاں اس کا امکان بھی ہے کہ اس کے خالق خود فاضل مصنف ہوں———

مختصر یہ کہ بجد مے بہاد نیور نگ" مولانا کامل سہرامی کی ایک ایسی لاجواب تصنیف ہے جو فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کی فضا میں پرورش پاتی ہے نیز تشبیہات و استعارات، طنز و مزاح اور محاورات کے جا بجا درست استعمال کی بنا پر چمنستان اردو کا سدا بہار گلدستہ کہلانے کی مستحق ہے۔

دراصل مولانا کامل اپنی انھیں خصوصیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں منفرد و یگانہ نظر آتے ہیں۔ اور اپنی اس تحریر کی روشنی میں خود کو ایک نقاد، انشا پرداز اور اچھا طنز و مزاح نگار تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت کامل سہرامی کی یہ تصنیف ایک لاجواب شاہکار ہے اور ان کا یہ کارنامہ تاریخ ادب اردو" میں سورج کی روپہلی کرنوں سے لکھا جائے گا ———

افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ اردو ادب کو آپ کی ذات سے مزید فائدہ پہنچتا، خدائے قدیر آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ——— آمین۔ بجاہ حبیبہ الکریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

دھوراجی کاٹھیاوار کا بقیہ صفحہ ۲۹ کا بقیہ

اس کے واسطے پچاس ہزار روپیہ اور آپ کے درگاہ کے واسطے پچیس ہزار روپیہ حاجی ہاشم نے پیش کیا ہے۔ اگر مزید روپیہ کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی دیں گے۔ دھوراجی میں ایک مسافر خانہ کے واسطے پچاس ہزار روپیہ اور یتیم خانہ اور بعض مساجد کے واسطے پچیس ہزار روپیہ کا اعلان کیا۔ حاجی ہاشم نے گنبد شریف پر ایک لاکھ کے قریب روپیہ خرچ کیا۔ اور دروازہ پر بھی زائد رقم صرف ہوئی۔ جزاہ اللہ فی [illegible]

نوٹ کیا یہ واقعہ موعظت و عبرت کے لئے کافی نہیں ہے۔ اللہ اکبر کیسے کیسے اصحاب خیر گذرے ہیں جن کی زندگی خود ایک مستقل تاریخ ہے۔

اللہ کے ولیوں سے وابستگی اور اظہار عقیدت ہمیشہ اہلسنت کا دستور رہا۔ اگر ان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میمن برادری اور حاجی ہاشم کے خاندان نے آستانہ جات مساجد اور دینی درسگاہوں کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ نام و نمود، دکھاوا اور بناوٹ اور ریا سے یہ دور رہے اللہ کی خوشنودی اور رضا کیلئے انہوں نے دینی خدمات انجام دیئے۔ چنانچہ یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے اور خدائے قدیر انہیں چھپڑ پھاڑ کر دیتا رہا۔ میں محترم حاجی حسن دادا اور مکرمی حاجی اسمٰعیل سے رابطہ پیدا کر کے میمن تاریخ حاصل کروں گا۔ اگر کوئی کتاب مل گئی تو انشاء اللہ تعالیٰ مستقلاً ایک تاریخ لکھوں گا۔ رب کریم اس خاندان کو سدا بہار رکھے۔ اور دینی خدمات کیلئے صدقوں سلامت رکھے۔ — نظامی

مشتاق احمد نظامی

مرحوم حاجی ہاشم کا خاندان

اور

صدقات وحسنات

اپنی علالت کے باعث میں نے تقریری پروگرام کو منسوخ اور ملتوی کر دیا تھا۔ ان دنوں میرا قیام دارالعلوم غریب نواز میں تھا۔ مولانا انوار احمد نظامی ناظم اعلیٰ دارالعلوم غریب نواز کتابوں کی ایک رجسٹری لیکر آئے جسے سرہند شریف کی واپسی میں محترم جناب حاجی محمد اسماعیل صاحب نے دلی سے بھیجا تھا اس پیکٹ میں کتابیں تھیں:۔ (۱) حضرت مجدد اور ان کے ناقدین ——— (۲) مقامات خیر — یہ دونوں کتابیں حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی کی تصنیف ہیں۔ موصوف ایک ممتاز ترین صاحب قلم مصنف ہیں دونوں کتابوں میں اچھی خاصی محنت کر کے واقعات کو چھان پھٹک کے بعد اکٹھا کرنیکی کوشش کی گئی ہے ———

"مقامات خیر" کا مطالعہ کر رہا تھا اسی ذیل میں دھوراجی کے ایک مخیر خاندان" حاجی ہاشم، حاجی ولی، صاحبزادگان حسن دادا" کے حسنات وخیرات کا ایک واقعہ نظر سے گذرا دل نے چاہا، ناظرین پاسبان کی ضیافت طبع کیلئے حاضر کر دیا جائے۔ یہ واقعہ اس اندازہ کیلئے کافی ہوگا کہ میمن برادری نے مساجد مقابر خانقاہوں اور دینی مدارس کیلئے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ چنانچہ، کاٹھیاواڑ کے ابتدائی دورہ میں وہاں کی مساجد کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ دھوراجی، اپلیٹہ، گونڈل، پوربندر، راجکوٹ جامنگر، جوناگڈھ اور بہت سے مقامات میں تقریری دورہ کر چکا ہوں۔ وہاں کی مسجد سجی سجائی دولہن کی طرح ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ اس کا بناؤ سنگار ہوتا ہے اسی لئے میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں نے اللہ کا گھر آباد کر رکھا ہے اس لئے اللہ نے ان کا بھی گھر آباد کر رکھا ہے۔ اور یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔

آج بھی ایچ ایم حاجی حسن دادا اور حاجی اسماعیل کنڈہ ہاشمی خاندان کے چشم وچراغ ہیں اور اپنے کردار وعمل خاندانی روایات کو برقرار رکھا ہے ان کے صاحبزادگان بمبئی اور سورت میں اعلیٰ درجہ کے تاجر ہیں اور اپنے آباد واجداد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ سرہند شریف جو اہلسنت کا مرکز عقیدت۔ اس آستانے سے اس خاندان کا حسب ذیل واقعہ میں رشتہ عقیدت ومحبت ملاحظہ فرمائیے۔ خدائے قدیر ان کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور آسیب روزگار سے محفوظ رکھے۔ آمین ——— "حضرت مجدد اور ان کے ناقدین" ایک بہترین اور معلوماتی کتاب ہے۔ آئندہ میں اس کے اقتباسات حاضر کروں گا۔ واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

دھوراجی کا کاٹھیاواڑ کا سفر

حضرت امام ربانی مجدد و منور الف ثانی قدس اللہ سرہٗ الاقدس کے عرس شریف کے سلسلے میں کاٹھیاواڑ سے میمن سرہند شریف جایا کرتے تھے ان میں سے بعض افراد آپکی خدمت میں بھی حاضری دیتے تھے۔ ۱۳۵۹ھ میں حاجی ہاشم حاجی ولی پسران حسن دادا جب سرہند شریف سے اول ماہ مبارک میلاد سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ واذکی التحیات۔ میں دلی

آئے قورات کے نو بجے آپکی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے حاجی ہاشم نے کہا میرے بچوں کی شادی ماہ صفر ۱۳۴۰ھ میں ہوگی اس موقع پر آپ دھوراجی ایک ہفتہ کے واسطے تشریف لائیں آپ نے فرمایا اس موقع پر ہم کوئٹہ میں ہوں گے۔ ہمارا سفر دھوراجی کا کیسے ہوگا۔ حاجی ہاشم نے کہا حضور اس کا انتظام میں کروں گا۔ انشاء اللہ آپکو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ نے ان کی محبت اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے ان کی، دعوت قبول فرمالی۔ حاجی ہاشم حاجی ولی کو آپ سے صرف

محبت تھی مرید اوروں کے تھے۔

حاجی ہاشم نے تین سمجھدار افراد کو چار صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء یوم پنجشنبہ کوئٹہ بھیجا اور انہوں نے سفر کا بند و بست کیا اور خیر سے آپ دوشنبہ ۸ صفر کو کوئٹہ سے روانہ ہوئے نو کو بعد مغرب لاہور پہونچے اور ایک شب اچھرہ میں قیام فرما کر دس صفر کو دلی روانہ ہوئے۔ اور پنجشنبہ ۱۱ صفر، ۱۳ اکتوبر کو دلی پہونچے۔ دو دن دلی میں قیام رہا۔ پانی پت سے ہمشیرہ صاحبہ اور نواب زادہ صاحب اور میرٹھ سے حافظ اشفاق الٰہی آئے۔ دلی سے مولوی بخش اللہ ساتھ ہوئے۔ دو پٹھان بھی ساتھ تھے۔ ان سب کا انتظام سفر میمنوں نے کیا شنبہ ۱۳ صفر مطابق ۱۵ اکتوبر کو بعد مغرب دلی سے روانہ ہو کر دوشنبہ ۱۵ صفر مطابق ۱۷ اکتوبر کو دس بجے دھوراجی پہنچے۔

یوم مشہود

دھوراجی پہنچنے سے پانچ سات اسٹیشن پہلے سے میمنوں کا ہجوم شروع ہوا تمام ریل ایسی بھری کہ کسی کا ہلنا مشکل ہوگیا۔ ہم تینوں بھائی جس ڈبے میں تھے جب وہ بھر گیا تو ہم تینوں آپ کے ڈبے میں، آگئے۔ وہاں یہ تماشہ دیکھا کہ حضرت والدہ صاحبہ و ہمشیرگان ایک کونے میں سمٹی ہوئی بیٹھی ہیں اور میمن آپ کو گھیرے ہیں لئے بیٹھے ہیں۔ کوئی آپ کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی آپکو دبا رہا ہے غرض ہر ایک اپنی نیازمندی کا اظہار کر رہا ہے۔ لوگوں کی کثرت اور ریل کی چھت پر ان کے بیٹھ جانے کیوجہ سے ریل بھی آہستہ چل رہی تھی۔ دھوراجی پر خلق خدا کا جو اژدھام لگا اس نے میز بانوں کو پریشان کر دیا۔ آپکو موٹر تک پہنچنا ان کے لئے مشکل ہوگیا۔ آپ کہیں، ہم کہیں، رفقا کہیں اس عاجز کو چند افراد گھیرے ہوئے تھے اور بہ ہزار دقت آپکو موٹر تک لے گئے۔ لوگ کہتے تھے کہ ایک لاکھ سے زائد افراد کا اجتماع تھا۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک سارے راستے موٹر پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ اور کوئی اپنے شوق میں دام و درم نچھاور کر رہا تھا۔

حاجی ہاشم نے آپ کے واسطے بہت بڑا دو منزلہ عمدہ مکان مہیا کیا تھا نیچے کی منزل میں ایک باورچی خانہ تھا۔ وہاں آپ کے اور آپ کے تمام رفقاء کے کھانے، چار کا بند و بست ہوتا تھا ایک بڑا کمرہ تھا وہ آپ کی بیٹھک تھی۔ چار پانچ کمرے رفقاء کیلئے تھے اور اوپر کی منزل آپکی رہائش کے لئے۔ پانچ چھ آدمی کام کرنے والے اور ایک منتظم رات دن رہتے تھے۔

محفل نکاح

عقد نکاح کی محفل منعقد ہونے کیلئے ایک بہت بڑا پنڈال بنایا گیا تھا اور طرح طرح سے اسے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ ایک طرف بڑا تخت بچھا تھا اس پر آپ تشریف فرما ہوئے اور آپ کے تخت کے سامنے تقریباً دس گز کے فاصلہ پر عروسان کے واسطے نشستگاہ بنائی تھی جسکی بلندی آپ کے تخت سے کم تھی۔ حاجی ہاشم کے دو بیٹوں اور غالباً دو ہی بیٹیوں کی شادی تھی۔ قاضی نے خطبۂ نکاح پڑھا اور ایجاب و قبول کرایا۔ آپ نے دعاء خیر کی۔ پھر چودھری عبد الغنی نے آٹھ ہزار روپیہ حاجی ہاشم کی طرف سے پیش کیا۔ اور عرض کی پانچ ہزار آپ کی نذر ہے اور ایک ایک ہزار تینوں صاحبزادوں کی۔ پھر چودھری عبد الغنی نے اعلان کیا کہ حضرت امام ربّانی قدس سرہٗ کے مزار پُر انوار پر سنگ مرمر کا عالی شان گنبد بنوایا جائے گا۔ سرِ دست

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

مولانا بدر الدجیٰ اشرفی

اقلیم سخن حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

ساتویں صدی ہجری میں سلطان شمس الدین التمش دلی کے تخت پر پورے کروفر کے ساتھ متمکن تھا اور یہی زمانہ تھا کہ چنگیز خانی فتنہ و فساد، ظلم و استبداد اور داروگیر نے دنیائے اسلام میں ایک حشر برپا کر رکھا تھا۔ اس نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ترکوں کے ایک قبیلہ لاچین کے ایک سردار امیر سیف الدین محمود اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان آئے۔ اور قصبہ مومن آباد جو اب پٹیالی ضلع ایٹہ کے نام سے مشہور ہے آکر سکونت پذیر ہوئے۔

سلطان التمش نے امیر سیف الدین محمود کی خداداد صلاحیت اور نیک اوصاف کی قدر کرتے ہوئے اپنے امراء میں شامل کر لیا کچھ ہی دنوں کے بعد امیر سیف الدین محمود کی شادی نواب عماد الملک کی دختر نیک اختر سے ہو گئی۔ جن کے بطن سے تین لڑکے اعز الدین علی شاہ حسام الدین احمد، اور ابوالحسن پیدا ہوئے موخر الذکر ابوالحسن ہی وہ تاریخ ساز ہستی ہے، جنہیں دنیا خسرو اقلیم سخن حضرت امیر خسرو کے نام سے یاد کرتی ہے۔

آپ ۶۵۲ھ میں پٹیالی میں پیدا ہوئے اور جب ہوش سنبھالا تو آپ کو سعد الدین خطاط کے پاس خوش نویسی کے لئے بٹھایا گیا چونکہ شعر و شاعری آپ کی فطرت میں داخل تھی اس لئے آپ چھوٹی سی عمر ہی میں شعر و شاعری سے دلچسپی لینے لگے۔ آٹھ نو سال کی کم سنی کا زمانہ تھا کہ والد ماجد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے نانا عماد الملک نے اپنے ہاتھ میں لے لیا جن کی عمر اس وقت ایک سو تیرہ سال کی تھی۔ قدرت کی عطا کردہ ذہانت و ذکاوت کے سبب آپ نے صرف ۱۶ سال کی عمر میں جملہ علوم عقلیہ، نقلیہ کی تکمیل کر کے اپنے زمانہ کے متبحر فضلائین شمار کئے جانے لگے۔

شاعری میں سب سے پہلے آپ نے اپنے بڑے بھائی اعز الدین علی شاہ سے اصلاح لی۔ ان کے بعد یگانہ روزگار خواجہ شمس الدین خوارزمی کی شاگردی اختیار کی علوم عقلیہ و نقلیہ، شعر و شاعری کی تکمیل کے بعد آپ کو کمالات باطنی کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا اور آپ نے سلطان المشائخ حضور خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی بارگاہ قدس میں حاضری کا ارادہ کیا۔ اور آستانہ محبوب الٰہی میں حاضر ہو کر آپ نے پہلے یہ شعر عرض کیا ؎

تو آں شاہے کہ بر ایوان قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

حضور محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دونوں شعر سماعت فرمانے کے بعد ہی فی البدیہہ ارشاد فرمایا ؎

بیاید اندروں مرد حقیقت
کہ باما یکنفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

حضرت خسرو نے یہ شعر سنا اور فوراً قدم بوس ہو کر شرف بیعت حاصل کیا اور حضور محبوب الٰہی کے جاں نثار مریدوں میں داخل ہو گئے، حضرت خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا جذبہ ازلی تھا۔ عشق کی بجلی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ اور جب آپ نے

سنہ ۶۱۳ھ میں بیعت ثانیہ حاصل کی تو آپ کا رنگ ہی بالکل بدل گیا جتنے نقد و اسباب تھے اللہ کے راستے میں دے دیا اور اس قدر ریاضت و مجاہدہ فرمایا کہ حضور محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ سب مریدوں سے زیادہ آپ کی طرف مبذول ہوئی۔ حضرت خسرو کی ارادت و عقیدت اپنے مرشد کے ساتھ عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، آپ نے مرشد کے جمال زیبا کو جینے کا سہارا اور ان کے دامن کرم کو نجات اخروی کا ذریعہ بنالیا تھا۔ اپنے مرشد برحق کے ساتھ آپ کی بھی محبت عشق صادق ہی کا نتیجہ تھا کہ حضور محبوب الٰہی اکثر فرمایا کرتے۔

خسرو میرے بعد زندہ نہ رہے گا جب وہ انتقال کرے میرے پہلو میں اسے دفن کر دینا چونکہ وہ میرا صاحب اسرار ہے اور میں اس کے بغیر جنت میں قدم نہ رکھوں گا۔ اگر شریعت مطہرہ ایک قبر میں دو شخصوں کو دفنانے کی اجازت دیتی تو میں وصیت کرتا کہ اسے میری قبر میں دفن کرنا تاکہ ہم دونوں قبر میں بھی یکجا رہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضور محبوب الٰہی لب دریا ہندوؤں کی عبادت اور ان کے نہانے کا منظر دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ (دیکھتے ہو) ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے۔ ہر قوم کا ایک مخصوص راستہ مخصوص دین اور مخصوص قبلہ ہے اس وقت حضور محبوب الٰہی کی کلاہ مبارک غیر ارادی طور پر کچھ ٹیڑھی تھی۔ چنانچہ خسرو نے برجستہ عرض کیا،، ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہے،، ہم نے اپنا قبلہ ایک ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف مخصوص کرلیا ہے۔

کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے اولین دور میں آپ کے کلام میں ساز تھا سوز نہ تھا اور کلام میں شیرینی اور تاثیر نہ ہونے کے سبب آپ رنجیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کچھ اشعار اپنے مرشد کی شان میں لکھ کر حاضر بارگاہ ہوئے، حضور محبوب الٰہی نے فرمایا،، خسرو اچہ میخواہی۔ عرض کیا۔ شیرینی کلام،، ارشاد ہوا، اندر چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی ہے اس کو اپنے سر پر سے نثار کر اور اس میں سے تھوڑی سی کھالے، بس کیا تھا آپ کو شیرینی کلامی کی دولت مل گئی۔ اور ایسی ملی کہ قیامت تک کہ آنے والے شاعر یہ دولت نہ پاسکیں گے۔

آپ عربی، فارسی، ترکی، اور ہندی چاروں زبان کے فاضل اور نظم و نثر میں یکساں یگانہ روزگار تھے۔ صرف منظوم کتابیں ۹۹ بیان کی جاتی ہیں۔ اور ہندی کلام کے علاوہ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہیں۔

سچ پوچھئے تو سات سو برس سے آج تک ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایران و روم کی مردم خیز زمین نے اس قدر گونا گوں اوصاف کے جامع دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے، ہم مانتے ہیں کہ فردوسی، حضرت شیخ سعدی انوری، حافظ، خاقانی، عرفی، نظیری بلاشبہ اقلیم سخن کے نامور و گرامی قدر تاجدار گزرے ہیں۔

لیکن فردوسی رزمیہ مثنوی سے آگے قدم نہیں باہر کرسکتے، حضرت شیخ سعدی نے قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انوری، خاقانی نے مثنوی اور غزل کو چھویا تک نہیں، حافظ، عرفی اور نظیری غزل کے دائرہ سے باہر کامیابی کے ساتھ قدم نہیں نکال سکتے۔ لیکن خسرو اقلیم سخن کی جہانگیری میں شاعری کے تمام اصناف غزل، مثنوی قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہیں۔ چشم فلک نے اتنے کمالات کا جامع شاعر انکے بعد آج تک نہیں دیکھا نہ ہی مادر روزگار نے انکے بعد آج تک اتنے جامع صفات کو اپنی آغوش میں لیا

جب حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی غیر موجودگی میں ۱۷ یا ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو وصال فرمایا اور آپ کو یہ اندوہناک خبر معلوم ہوئی تو آپ زار و قطار روتے ہوئے دہلی پہنچے اور اپنی خوب صورت زلفیں کٹوا کر مرشد برحق کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے اور نہایت رقت سے عرض کیا۔

سبحان اللہ آفتاب زیر زمیں چھپ جائے اور خسرو روئے زمین پر زندہ رہے یہ کہہ کر سر کے بل مزار مبارک پر گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔

ہوش آنے پر اپنا کل مال و متاع، نقد و جنس غربا و مساکین پر تقسیم کردیا اور ماتمی لباس پہن کر اور دنیا سے الگ ہو کر مرشد کے مزار کے قریب آبیٹھے اس کے بعد کسی نے آپ کو ہنستے نہیں دیکھا

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

پروفیسر محمد طفیل سالک ایم۔اے۔ ایل ایل بی۔

اسلام کا نظریۂ سزا اور اصلاح معاشرہ

جرم اور اس کی سزا حکمائے اخلاق و قانون کا ہمیشہ سے ایک معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ جرائم کیوں ہوتے ہیں۔ اور ان کا تدارک کیسے ممکن ہے؟ جرم کی سزا کس لئے دی جانی چاہیئے؟

کیا اس کا مقصد مجرم کی اصلاح ہونا چاہیئے۔ یا اس سے انتقام لینا یا اس لئے سزا دی جائے کہ دہشت و خوف پیدا ہو تا کہ آئندہ کوئی ایسا کرنے کی جراُت نہ کر سکے۔ ورنہ سخت سے سخت سزا بھگتنے کے لئے تیار رہے۔

رومیوں کا نظریۂ سزا انتقامی (RETRIBUTIVE) تھا یعنی مجرم کو انتقام کی خاطر سزا دی جاتی تھی اور آج مغرب سزا کے اصلاحی نظر (REFORMATIVE THEORY) کا علمبردار تھا۔ مگر غور کیا جائے تو یہ دونوں نظریات سزا کے مقاصد کو پورا نہیں کرتے، مجرم سے محض انتقام لینے کا جذبہ جوہر انسانیت سے عاری نظر آتا ہے اور مغرب آج جس نظریہ اصلاح پر عمل پیرا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں جرائم کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

سزا کے اس نظریہ اصلاح کے حق میں مغرب یہ دلیل دیتا ہے کہ مجرم سے جرم مثلاً قتل۔ تو بوجوہ سرزد ہو گیا اور معاشرہ ایک انسانی جان سے محروم ہو گیا۔ لیکن بعد میں قاتل کو جرم قتل کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار کر ایک اور انسانی جان سے محروم ہو جانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ گویا موجودہ اہل مغرب مجرم کے لئے تخفیف کو بطور ایک احسان و مروت کے نہیں بلکہ بطور ایک قانونی اور آئینی حق کے مانگتے ہیں۔ اگر رحم و تخفیف کو بطور ایک قاعدہ کلیہ کے مان لیا جائے اور کوئی استثنائی صورت بھی باقی نہ رہنے دی جائے تو اس سے سزا کا خوف اور قانون کا رعب داب بالکل ختم ہو جائے گا اور انسان جرائم کے ارتکاب و اعادہ میں کوئی باک محسوس نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب کے اس اصلاحی نظریۂ سزا کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں تہذیب و تمدن کی ترقی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود اور تعلیم و تحقیق کی ہمہ گیر اشاعت کے علی الرغم جرائم کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے ۔ اور معاشرتی سکون درہم برہم ہو کے رہ گیا ہے۔

اس سلسلے میں مغرب سے غلطی یہ سرزد ہوئی ہے کہ وہ قاتل سے تو ہمدردی ظاہر کرتا ہے مقتول سے نہیں۔ اگرچہ اس تصور کی نفسیاتی بنیاد یہی ہے کہ انسان عام طور پر ایسی صورتوں میں قاتل ہی سے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ تاہم اگر جذبات کو ہوش و خرد کے تابع رکھا جائے۔

یا دوسرے لفظوں میں جذبات سے مغلوب ہونے کی بجائے عقل و فکر کے تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ ظالم کے ظلم کی تائید اور اس سے تعاون اور خود مظلوم سے ظلم کے مترادف ہے اور عدل انصاف کے تقاضوں کے یکسر منافی ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اور عدل و اعتدال کا مسلک اس نے ہر معاملہ میں فطرت انسانی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے اور افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی ہے۔ اس لئے اسلام روم و مغرب کے نظریات کے برعکس۔ تیسرے نظریئے سے زیادہ قریب ہے کہ مجرم کو سزا اس لئے دی جائے کہ خوف و دہشت پیدا ہو اور اسے خود اس جرم کے آمادہ کی جراُت نہ ہو۔ وہاں دوسروں

کے لئے بھی نشانہ عبرت بنے تاکہ وہ بھی آئندہ اقدام جرم سے باز رہیں۔

اسلام نے مختلف جرائم کے لئے جو سزائیں تجویز کی ہیں انہیں شرعی اصلاح میں حدود و تعزیرات کہتے ہیں۔ حدود وہ سزائیں ہیں جن کی تعین قرآن حکیم نے کردی ہے اور جو کسی حالت میں معاف نہیں ہو سکتیں۔ انہیں حدود اللہ بھی کہتے ہیں اور یہ سات جرائم میں دی جاتی ہیں۔ چوری رہزنی زنا، قذف، شراب خوری، ارتداد اور بغاوت، ان کے برعکس تعزیرات وہ سزائیں ہیں جو حالات کی نوعیت اور قاضی کی صوابدید پر منحصر ہیں یعنی واقعات و حالات کے مطابق قاضی ان میں کمی بیشی کر سکتا ہے کوڑے مارنا، زجر و توبیخ کرنا، قید کرلینا وغیرہ تعزیرات ہی کے زمرے میں آتی ہیں۔

قتل کی سزا بیشک قرآن حکیم نے تجویز کی ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، جان کے بدلے جان، یعنی مقتول کے ورثا معاف بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے قصاص کو حدود العباد بھی کہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اسلام نے فطرتِ انسانی کے اسی تقاضوں کو مدنظر رکھا ہے اور معاشرۂ انسانی میں رحم و شفقت کے جذبات کی نشو و نما کو محض جرم سے انتقام لینے کے جذبہ پر ترجیح دی ہے۔ لہٰذا اسلام کا نظریہ سزا انتقامی ہونے کی بجائے امتناعی نوعیت کا PREVENTIVE OR DETERREHT ہے۔

اسلامی قانون کی رو سے قتل کی دو قسمیں قتل خطا، یعنی غلطی سے قتل۔ جس میں قصاص نہیں بلکہ دیت یا خون بہا کی ادائیگی ہے۔ اور قتل عمد۔ یعنی جان بوجھ کر قتل۔ اسی میں قاتل گردن زدنی ہوگا۔ اور اسے بھی پہلی مرتبہ۔ مقتول کے ورثا خون بہا لیکر جاں بخشی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی انسانیت پر اسلام کے من جملہ احسانات سے ہے کہ اس نازک مرحلے میں بھی اس نے انسان پر رحمت و شفقت کا سایہ کیا ہے۔ اس علیم کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ قصاص اسی وقت قائم ہوگا جب مقتول کے ورثا اس کا مطالبہ کریں گے ورنہ حکومت اپنے طور پر اس پر اصرار نہیں کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر مختلف جرائم کی طرح قتل کے معاملہ میں بھی قرآن حکیم کی حکیمانہ تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ معاشرۂ انسانی امن و امان کا گہوارہ اور شفقت و رافت کا منظہر بن جائے گا۔

اسلام کی نظر میں اخلاق و قانون کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جرم کا بڑا سبب خواہشات نفسانی کی بے اعتدالی ہے۔ جس کی روک تھام اسلامی نقطۂ نظر سے دین و معاشرہ کے اہم مبادیات سے ہے۔

قرآن حکیم نے اس سلسلے میں تصور الٰہ اور خوف آخرت کے نظریہ پر زور دیا ہے۔ ایک بزرگ و برتر حاکم مطلق اور اخلاق عالم کا تصور ———— اور آخرت میں اس کے حضور جواب دہی کا احساس اگر انسان کے ذہن میں پختہ اور راسخ ہو جائے تو جرم سرزد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ناندگاؤں کی مسجد

حضرت مولانا سجاد حسین صاحب جماعت اہلسنت کے انتہائی مخلص، محنتی اور جفاکش عالم ہیں۔ برسہا برس آپ نے ایک قلیل مشاہرے پر دینی خدمات انجام دیا ہے قبرستان والی مسجد بہت ہی مختصر اور مصلیان مسجد کے لئے ناکافی تھی۔ چنانچہ مولانا سجاد حسین صاحب کے زیر اہتمام اسے شہید کرا کے از سر نو اس کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ درج ذیل پتے پر اپنی رقمیں ارسال کر کے داخل حسنات ہوں۔

مولانا سجاد حسین صاحب قبرستان والی مسجد۔ ناندگاؤں

ضیائی سہاگلپوری سب ایڈیٹر

پٹاخ، پٹاخ، پٹاخ نہ جانے کتنی آوازیں فضا میں گونج گئیں۔ اور ماحول یکایک سکوت بردوش ہوگیا۔ جب میں قریب پہنچا تو دیکھا انجان علی رشیدی اپنے بیس سالہ نوجوان لڑکے کو صرف اس بنا پر پیٹ رہے تھے کہ وہ اکثر میلاد شریف کی محفلوں اور جلسے جلوس میں شریک ہوا کرتا تھا اور اس پر بھی تک یہ کہ اس سال وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اجمیر شریف چلا گیا تھا" ایک تو کریلا اس پر نیم چڑھا،" ——— صوفی جی بار بار کہے جا رہے تھے۔ اب تو ایسی غلطی نہیں کروگے .... دوسرے دن اسی محلے کی گلیوں میں چند ایسے باکرامت بزرگ گشت کرتے ملے۔ جن میں ماڈرن پتیلی، استو اور استو کی گٹھری ڈھوتے ڈھوتے کسی کی گردن جھک گئی تھی، کسی کی کمر ٹیڑھی ہو گئی تو کوئی لنگڑا کر چل رہا تھا۔

مگر سب اپنا اپنا بوجھ اپنے سر اور کندھوں پر لئے گھوم رہے تھے۔ جب صوفی جی کے دروازے پر پہنچے تو اتفاق کی بات کہ صوفی جی باہر ہی بیٹھے اپنی داڑھی کھجا رہے تھے۔ نظر پڑتے ہی۔ السائکم! السائکم۔ کی ایسی بھیڑ لگادی ...... کہ صوفی جی جواب دینے کی بجائے بوکھلا گئے اور اسی بوکھلاہٹ اور بدحواسی میں بیٹھے بیٹھے تشریف رکھتے کہتے ہوئے اندر چلے گئے اور اپنی بیوی سے جا کر فخریہ کہنے لگے۔ جانتی ہو بیگم۔؟ آج میں کتنا خوش نصیب ہوں ——— بیوی نے کہا کیا بات ہے۔

خوش نصیبی کا کون سا ستارہ چمک اٹھا ——— ؟ صوفی جی نے کہا۔ تمہیں نہیں معلوم ہمارے دروازے پر کیسی کیسی ہستیاں تشریف فرما ہیں۔ یہ جماعت ایسی ہے کہ جہاں

جناب مولانا ماہر القادری

نعت شریف

ٹکرائے گی دعا مری باب قبول سے
نسبت ہے مجھکو دوستو آل رسول سے

تلوؤں سے ان کے بھیک ملی مہر و ماہ کو
شرمندہ کہکشاں بھی ہے قدموں کی دھول سے

تاریکی لحد میں اجالے کے واسطے
جلوؤں کی بھیک مانگ دیار رسول سے

جنت نظیر ہوگئی خوشبو سے میری قبر
آئی مہک جو گلشن طیبہ کے پھول سے

سجدے نہ دینگے انکی جبینوں کو روشنی
نجدی کا قلب خالی ہے حب رسول سے

جب جھوم کر کسی نے کیا ذکر مصطفٰے
وہ شاد شاد ہو گئے جو تھے ملول سے

ماہر ضرور آئی ہے مجھکو نبی کی یاد
مشکل میں جب بھی پھنس گئے ہم اپنی بھول سے

پہنچ جائیں۔ تو اس کی خوابیدہ قسمت ہی جاگ جائے ——— ذرا چائے وائے بنا دو —؟ اچھا ٹھہرو! ذرا میں بھی زیارت کر آؤں ان باکرامت بزرگوں کی — بیوی نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور دروازے کی اوٹ سے جا لگی۔ بہت دیر تک کھڑی ان بزرگوں کے جسم کی بناوٹ اور شکل صورت کی سجاوٹ کا جائزہ لیتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی — یا اللہ! یہ آلتی پالتی مارے براجمان کیسے بزرگ ہیں ——— یہ ایک ہاتھ کی لمبی سفید داڑھی، یہ پیشانی اور ناک پر دو انچ کے رقبہ میں پھیلا ہوا سیاہ دھبہ، یہ گول ٹوپی، اور جب ٹوپی اتار دیں تو ان کا حسن اور دوبالا ہو جائے۔ یوں معلوم ہو کر اس بار کی خشک سالی کا پورا پورا اثر ان لوگوں کے سر ہی پر ہوا ہو۔ اور باد خزاں کے تیز و تند جھونکوں سے پت جھڑ کی طرح ان کے سر کی کھیتیاں ویران ہو گئی ہوں ——— ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ وہاں سے ہٹنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ان لوگوں کی گفتگو کچھ اس قسم کی شروع ہو گئی کہ لامحالہ ان کو اس سے دلچسپی معلوم ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے پھر کھڑی ہو گئی اور دھیان سے سننے لگی ——— صوفی غل پسند جو سامنے پلنگ پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے وہ کہہ رہے تھے ——— کیا بات ہے۔؟ ہم لوگ کس کا منہ دیکھ کر چلے ہیں کہ جہاں جاتے ہیں وہاں سے بھگائے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مدنپورہ کی سنی بڑی مسجد میں گئے تو وہاں سے لات جوتے کھا کر بھاگے۔ کانپور کی جامع مسجد میں پہنچے تو وہاں ان لوگوں نے مسجد دھلوائی اور گردن پر ہاتھ رکھ کر بھگا دیا۔ اور احمد آباد کی جامع مسجد میں تو اور غضب ہوا۔ وہاں دروازے کے باہر کسی چیز کی گندگی پڑی ہوئی تھی۔ جب امام صاحب! اور ان کے ساتھ دو تین آدمی آئے تو ہم لوگوں پر برسنے لگے۔ کہ آپ لوگ مسجدوں میں خدا اور رسول کی بات کرنے آتے ہیں یا کھانے سونے اور گندگی پھیلانے۔ ——— چنانچہ اس کو اپنے ہاتھوں سے پھینکنا پڑا وہاں سے تو اور بری طرح ذلیل کر کے نکالے گئے ——— دو ماہ سے زائد ہو گئے مگر اب تک تنخواہ بھی نہیں ملی ہے ——— اس کے بغل والے نے کہا ——— اسکے بعد ہی صوفی شر پسند بھی بول پڑے۔

حضت جی فرما رہے تھے کہ اب تک کوئی ڈرافٹ نہیں آیا ہے۔ اس لئے دیر ہو رہی ہے ——— امیر جماعت جو بالکل کنارے ہاتھ پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے انھوں نے سب کو صبر دلاتے ہوئے کہا ——— ابھی تو پہلی بار اور پہلا موقعہ ہے۔ کچھ روز اور انتظار کر لیں اگر ہم لوگوں کے ساتھ یہی رویہ رہا اور ایسی ہی ناانصافی ہوتی رہی تو پھر اس کام کو لات مار کر چھوڑ دیں گے۔ اتنی بے عزتی بھی اٹھاؤ ذلیل و خوار بھی ہو اور وقت پر تنخواہ بھی نہ ملے تو کیا فائدہ۔؟

جو لوگ پرانے ہو چکے ہیں وہ تو خوب موج اڑاتے ہیں۔ اور ہم لوگ جو نئے ہیں اس لئے بہکاوے میں رکھنا چاہتے ہیں ——— بیگم ——— ! صوفی جی نے اندر سے آواز دی ——— ان کی بیگم ان بزرگوں کی شکل و صورت اور بات چیت پر نفرین کرتی ہوئی اندر گئی اور بادل ناخواستہ چائے بنانے بیٹھ گئی ——— صوفی جی باورچی خانے میں آ کر مشورہ طلب انداز میں بیوی سے کہنے لگے ——— انہیں لوگوں کے ساتھ میں چاہتا ہوں کم از کم ایک آدھ چلہ گذارنے کے لئے احسان علی کو بھیج دوں۔ تمہاری کیا رائے ہے ——— ؟ ——— ان مکاروں کے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی مکار بناؤ گے۔ اس کی زندگی کی مٹی پلید کرو گے ——— ؟؟ آؤ تو میں ان کی حقیقت بتاؤں ——— بیوی نے صوفی جی کے ہاتھ میں چائے کا ٹرے دیتے ہوئے کہا ——— چونکہ بیوی پڑھی لکھی اور سمجھدار تھی، اچھے برے کی تمیز رکھتی تھی۔ کتابوں کا مطالعہ کافی تھا۔ اس لئے ان حضرات کی مختصر سی گفتگو میں ہی ان کی پوری حقیقت کو

(بقیہ ۳۷ پر)

مسلمان اور عبادت

جدید دور کو ایٹامک دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج کا انسان ترقی کی ان منازل تک پہنچ چکا ہے۔ جن کے لئے گذشتہ زمانہ میں تصور کرنا بھی نا ممکن تھا۔ آج ہم گھر بیٹھے لاکھوں میل دور کی خبریں سن لیتے ہیں۔ سکنڈوں میں میلوں کا سفر کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن اب ذرا اس زمانہ کا تصور کیجئے۔ جب انسان مشینوں کا محتاج نہ تھا بلکہ اسے اپنی قوت بازو کا حل ملتا تھا۔

ایمان کی خوبصورت روشنی سے یہ دنیا تاریک تھی اور تاریکی عظیم گناہوں کا پیش خیمہ تھی۔ لیکن عرب کے چاند نے جلوہ افروز ہو کر تاریکی کو روشنی سے بدل دیا۔ گناہوں کو دم توڑنا پڑا اور زندگی اصولوں کی پابند ہو گئی یہ اصول اسلام نے پیش کئے۔ اور آج انھیں اصولوں کو دوسری قومیں بھی اپنانے پر مجبور ہو گئیں۔

مساوات کا سبق اسلام نے پڑھایا آج کمیونزم اسی مساوات کا علمبردار بنا ہوا ہے۔ چھوت چھات اسلام نے مٹائی اور آج اس کے وجود کو ختم کرنے کی ساری دنیا کوشش کر رہی ہے۔ شراب نوشی اسلام نے حرام ثابت کیا اور آج ہر قوم اس کی مخالف نظر آتی ہے۔ اسلام نے کئی شادیوں کی اجازت دی۔ بیوہ عورت سے شادی کرنا عین ثواب ٹھہرایا اب یہ دونوں باتیں دیشوں کے آئین میں جائز قرار دی جانے لگی ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے اصولوں سے نفرت ہو گئی اور دوسرے لوگ ہمارے اصولوں سے فیضیاب ہو رہے ہیں اسلام کا مقصد مسلمانو کو غلام بنانا ہرگز نہیں ہے بلکہ اسلام تو آزادی اور مساوات کا جھنڈا بلند کرتا ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ صرف ایمان داری سچائی، فرض شناسی اور عبادت گذاری اس کی شرط ہے لیکن ہم اور آپ یہ معمولی سی شرط بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جب کسی مکان کی تعمیر ہوتی ہے تو اس کی چہار دیواری کی ضرورت کیوں پڑتی ہے ؟

شاید اس لئے کہ آپ سب سے پہلے حدود قائم کر لینا چاہتے ہیں مکان کو لامحدود رکھنا شاید آپ کو پسند نہیں ہوتا یا پھر آپ مجبور ہوتے ہیں پھر اگر اسلام نے آپ کو زندہ رہنے کے لئے کچھ حدود قائم کر دی ہیں تو آپ ان سے دور بھاگنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ ؟

اگر غور کیا جائے تو کسی اصول کے بغیر تو آپ ایک دن بھی گذارا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو کبھی پیروں کے بجائے ہاتھوں سے چل دکھائے تو میں سمجھوں کہ واقعی اصول کے بغیر بھی زندگی گذاری جا سکتی ہے۔ دراصل یہ تو آپ کا اصول بن گیا ہے کہ آپ کو پیروں سے چلنا ہے اب اس میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اگر خدا بھی اپنے اصولوں کو زبردستی منوانا چاہتا تو کیا اس کے لئے ممکن نہ تھا ؟ بالکل ممکن اور یقینی تھا۔ مثال کے طور پر فرض کر لیجئے کہ اسے فجر کی نماز روزانہ ہر انسان سے پڑھوانا ہوتی تو وہ ہر انسان کے منہ کو اس وقت تک کھلنے نہ دیتا جب تک کہ فجر کی نماز نہ پڑھ لیتے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی نافرمانی کرتا تو کب تک۔ ایک نہ ایک دن بھوک اس پر غالب آجاتی اور پھر وہ فجر کی نماز پڑھنے پر مجبور ہو جاتا۔

اسی طرح وہ اپنی ہر عبادت کے لئے اسی قسم کی بہت سی پابندیاں لگا کر انسان کو مجبور کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور انسان کو پورے طور پر آزاد چھوڑ کر آزادی کا سبق دیا۔

آج اس آزادی کا غلط فائدہ اٹھانا کتنی دغابازی ہے۔

آج اگر کوئی نوجوان برسر روزگار ہو کر اپنے والدین سے منہ موڑ لیتا ہے۔ ان کی امداد نہیں کرتا۔ تو وہ والدین کس طرح شکوہ و شکایت کے بازار گرم کر دیتے ہیں۔ دوست رشتہ دار برا بھلا کہتے ہیں۔ ساری دنیا نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن کیا کسی انسان پر خدا سے زیادہ والدین کا حق ہوتا ہے؟

ہرگز نہیں!

تو پھر خدا کی نافرمانی کرنے والے انسانوں کو عبادت گذاری کے لئے کیوں نہیں مجبور کیا جاتا! اگر کوئی بندہ خدا کسی کو عبادت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے الزام لگائے جاتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر آپ کے گھر کوئی ملازم ہو اور وہ آرام سے بیٹھے بیٹھے روٹی کپڑا اور تنخواہ کی خواہش کرے تو کیا آپ اس کی بات پوری کر سکیں گے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اسے ایک دن بھی اپنے گھر میں رکھنے کے روادار نہ ہوں گے۔ یا اگر کسی والدین کی اولاد ناخلف نکل گئی ہے اور وہ والدین کافی سرمایہ دار ہیں تو انھیں اپنی اولاد کو ایک رتی بھی کوئی چیز دینا گوارہ نہ ہوگی۔

خدا نے ہمیں پیدا کیا ہم پر بیحد احسان کئے پھر بھی اس نے ہماری زندگی کے لئے جن اصولوں کو ضروری قرار دے دیا ہے۔ ہم انہیں بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اس پر بھی ہم اس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگاتے کہ وہ ایسی حالت میں بھی پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا دیتا ہے۔

لیکن اگر ہم آج بھی سے اسلام کے اصولوں کو اپنانے کے لئے تیار ہو جائیں روزے رکھنے لگیں، نمازیں پڑھنے لگیں تو کیا اس کی رحمت جوش میں نہ آئے گی۔ جو خدا اتنی نافرمانیوں اور گناہوں پر کھانے اور پہننے کو دے رہا ہے وہ فرماں برداری اور عبادت گذاری پر کیا انعام و اکرام دے گا۔ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر آپ اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ دنیاوی مشکلات سے تنگ آ چکے ہیں اور اپنے پروردگار کی نظر کرم کے متمنی ہیں۔ تو آج ہی عبادت و اطاعت الٰہی کے لئے کمر بستہ اور تیار ہو جایئے۔ انشاء اللہ آپ کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی، سکون و چین نصیب ہو گا۔ اور پھر ہر مسلمان پستی کے قعر عمیق سے نکل کر بلندی و برتری کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

زخمی قلم کا بقیہ صفحہ ۳۵ سے آگے

زخمی قلم کا بقیہ صفحہ ۳۵ سے آگے

سمجھ بیٹھی تھی ــــــ صوفی جی چائے پلا کر واپس ہو رہے تھے کہ اچانک ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور ساری پیالیاں چکنا چور ہو گئیں ــــــ بیوی نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ شاباش! یہ کیوں گری معلوم ہے آپ کو! اس لئے کہ ان مکاروں اور بیہودی صفت انسانوں کا منہ اس میں لگ چکا تھا ــــــ اللہ تعالیٰ نے یہ گوارہ نہ کیا کہ جس پیالی میں کسی بیہودی صفت انسانوں کا منہ لگ جائے اس میں میرا پیارا بندہ منہ لگائے ــــ کیا مکار مکار بک رہی ہو، تمہیں اس کے علاوہ اور کیا سوجھتا ہے ــــــ

صوفی جی نے بگڑتے ہوئے کہا ــــ یہ مکاری نہیں تو اور کیا ہے۔ خدمت خلق اور تبلیغ دین کے نام پر اچھی خاصی تنخواہ وصول کرتے ہیں ــ اور ساتھ میں ہانڈی پتیلی اور ستو کی گٹھری رکھ کر لوگوں کو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم لوگ کسی کا نہیں کھاتے۔ اپنا کھا کر اپنے خرچ سے دین کی اشاعت کرتے ہیں ــــ بیوی نے جواب دیتے ہوئے کہا صوفی جی اب ضد پر اتر آئے کہ اب احسان علی کو ان لوگوں کے ساتھ بھیج ہی دیں تو اچھا ہے ورنہ اس کی صحبت میں یہ بچہ خراب ہو جائے گا ــــــ جب صوفی جی باہر آئے تو دیکھا کہ وہ لوگ غائب ہو چکے ہیں چونکہ وہ لوگ بہت دیر سے ان کی بیگم کی حقیقت آمیز تلخ گفتگو سن رہے تھے۔ یہ سوچ کر فرار ہو گئے کہ کہیں ہم لوگوں کا کچا چٹھا نہ کھل جائے۔ پھر اس کے بعد کافی دیر تلاش کرنے کے بعد بھی نہ مل سکے ــــــ آخر کار صوفی جی دل مسوس کر رہ گئے۔

مولانا اسلم بستوی

مرے زخمی لبوں کو اور دو زخموں کی سوغاتیں

ملک کے نحیف و نزار ہاتھوں سے غلامی کی آہنی بیڑیاں کٹے ہوئے ۳۲ سال ہو چکے ہیں، لیکن دورِ غلامی میں نفرتوں کا جو بیج دلوں میں بویا گیا تھا اس کی بیخ کنی کے بجائے انسانی خونوں سے اس کے پودے کی مسلسل آبیاری کی جاتی رہی۔ اور یہ خون کبھی بھونڈی سے حاصل کئے گئے، کبھی جل گاؤں سے، کبھی احمد آباد، کبھی راوڑکیلا، کبھی کلکتہ، کبھی سنبھل، کبھی علی گڈھ، کبھی رانچی اور کبھی جمشید پور سے ——— یہاں تک کہ نفرتوں کا یہ پودہ اب تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے، جس کو ہرا بھرا رکھنے کے لئے شاید اب انسان کے توانا خون کی ضرورت ہے اور غالباً یہ توانائی جمشید پور سے زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے تو وہاں ایک کے بعد دوسرا بھیانک فساد برپا کر کے وافر مقدار میں خون حاصل کیا گیا۔

لیکن ان خون حاصل کرنے والے خونی درندوں کو شاید اس کا احساس نہیں ہے کہ جمشید پور کے فسادات کے بھیانک شعلوں میں صرف مکانات، دوکانیں اور انسانی جسم نہیں جلے ہیں بلکہ ایک باغیرت، حیادار ملک کے پاس عزت و آبرو کی جو متاع ہو سکتی تھی وہ بھی جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ ——— جمشید پور کے چند ہزار مظلوم ہی بے گھر و عریاں نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس ملک کی ساری حیوانیت ننگی ہو کر سامنے آگئی ہے۔

آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس ملک نے بدھ، ٹیگور، اور گاندھی کو پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ تو صرف پرچھائیاں تھیں۔ شاید چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی، اور دنیا کے تمام خون خوار انسانوں کا خمیر اہنسا اور شانتی کے غلاف میں لپٹی ہوئی اسی سرزمین پر تیار ہوا تھا۔ آزادی کے ۳۲ سال کے اندر ہی یہ غلاف بھی اتر گیا۔ اب ہمیں ضرورت نہیں کہ ہٹلر کو انسانیت کا بدترین دشمن اور سنگ دل مجرم قرار دیں۔ جس نے ہزاروں یہودیوں کو گیس چمبر میں ڈال کر فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اب تو اسی سرزمین پر درندہ صفت انسانوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا ہے۔ جو مجبور اور بے کس انسانوں ——— عورتوں، بچوں، بوڑھوں کے ہاتھ پیر باندھ کر انہیں ذہن و ضمیر کی ذرہ برابر خلش کے بغیر آگ میں پھینک سکتا ہے۔

یہ ملک تیزی کے ساتھ وحشت و بربریت کی طرف لوٹ رہا ہے۔ خود غرضی اور فرض ناشناسی لاقانونیت اور انتشار کا ایک سیل بے اماں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

ان قاتلوں اور خون خواروں کی تاریخ اس ملک میں بڑی شاندار رہی ہے۔ انھوں نے آزادی کے بعد سب سے پہلے اپنے خونی پنجے اہنسا اور عدم تشدد کا مضبوط نعرہ دینے والے کے نحیف و ناتواں جسم پر آزمائے تھے۔

اور اپنی اس پہلی اور تاریخی کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد انھوں نے ظلم اور پاپ کی انگنت اولادوں کو جنم دیا۔ ہندوستان کے

مریض سماج نے ان درندوں کو زہر کا پیالہ دینے کے بجائے دودھ کا جام پیش کیا۔ سیاست کے ایوانوں میں یہ درندے پارٹیاں بنا کر اور خوبصورت و دلکش نعرے لگا کر آئے سماج میں انھوں نے لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر اپنی عظمت اور اہمیت کا سکہ چلایا، تعلیم گاہوں میں ہندوستان کی تاریخ کو بھیانک اور خوفناک طریقے سے مسخ کر کے نوجوان نسلوں کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر پیوست کیا اور معشیت کے میدان میں اکثریت کے پست ترین جذبات کو برانگیختہ کر کے لوٹ کھسوٹ کے ہزاروں فتنے برپا کئے۔

سیاسی لیڈروں نے ان کی سیاہ کاریوں کے لئے طرح طرح کے فلسفے تراشے، کبھی رد عمل (EACTION) کی تھیوری بنائی گئی کبھی توازن قائم رکھنے کے لئے ظالم و مظلوم دونوں کو برابر کا مجرم قرار دیا گیا ——— اور آج فرقہ واریت، تعصب تنگ نظری، انسانیت کشی اور حیوانیت کا یہ عفریت شہروں اور بستیوں کو اجاڑ دیا ہے۔ اس کے نقش قدم پر چلنے والوں کی ٹولیاں کھلے عام ظلم و تشدد کا ننگا ناچ، ناچ رہی ہیں۔ ۳۲ سال کے اندر فسادات کی واردات اس تسلسل کے ساتھ ہوئی ہیں کہ اگر ان میں بہنے والے انسانی خون کو کسی جگہ جمع کیا جاتا تو یقیناً اس کے اندر پارلیمنٹ کی پوری عمارت غرق ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں کی حکومت (خواہ وہ کانگریس کی رہی ہو یا جنتا کی) جو ایشیا میں اپنے امن و انصاف کا واحد علمبردار ہونے کا ڈھنڈورہ پورے عالم میں پیٹتی رہی ہے۔ وہ ان خون چکاں مناظر کو دیکھتی رہی۔ تحقیقاتی کمیشن کہنے کو تو ہمیشہ بنائے جاتے رہے لیکن اس نے ہمیشہ اصل مجرموں پر خوبصورتی سے پردہ ڈالنے اور مظلوموں کو الٹے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ لہٰذا آپ جمشید پور میں اس سے کچھ توقع رکھنا اعلیٰ درجے کی خوش فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بے گناہوں کے خون کے بدلے ایک بھی شخص ان کو جمشید پور کے گندے سماج میں ایسا نہ ملا جسے وہ تختہ دار پر چڑھا سکیں۔ البتہ دیکھنے والوں نے یہ ضرور دیکھا کہ مظلوموں کی امداد و ہمنوائی کرنے والے مولانا ارشد القادری اور دیگر مظلومین کو جیل کی کالی کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا۔ درآنحالیکہ سماج کے وہ گندے عناصر جنھوں نے جمشید پور میں چند ہی مہینوں کے وقفہ میں دوبار بھیانک فساد برپا کیا وہ جمشید پور کی شاہراہوں پر کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں۔

لندن کے لئے علامہ نظامی کی روانگی

ابراہیم ماسٹر ٹھاکر "دریڈیا ضلع بھڑوچ گجرات" کے رہنے والے ہیں جو ان دنوں انگلینڈ میں اپنے بھائی کے یہاں مقیم ہیں۔ وہاں کسی دیوبندی عالم سے مناظرہ طے ہونے کے بعد انگلینڈ کی تمام انجمنوں نے "بحیثیت مناظر" علامہ نظامی صاحب کو مدعو کیا ہے۔ علامہ نظامی صاحب قبلہ اپنی بیماری (اختلاج قلب) کے باعث ہوائی جہاز کا سفر نہیں کر پاتے۔ لیکن مناظرہ کی خاطر انہوں نے اس دعوت کو منظور کر لیا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں علامہ نظامی نے مفکر اسلام مولانا قمر الزماں اعظمی، خطیب اہلسنت مولانا محمد حنیف صاحب اور اپنے دیرینہ رفیق جناب ابراہیم ماسٹر ٹھاکر کو خط بھیجا ہے۔ اگر مناظرہ ہی ہے تو میرا پہنچنا یقینی ہے اور اگر مناظرہ کے بہانے محض تقریری پروگرام کے لئے دعوت دی گئی ہے تو یہیں کے مشاغل اتنے ہیں جن سے مجھے فرصت نہیں۔ آپ کا انٹرنیشنل پاسپورٹ بن رہا ہے۔ اگر مناظرہ ہونا یقینی ہے تو انگلینڈ کا پروگرام بھی یقینی ہے۔ ابراہیم ماسٹر ٹھاکر سے علامہ نظامی کے مخلصانہ تعلقات ہیں وہ ان کی باتوں کو ٹالتے نہیں ہو سکتا ہے اواخر دسمبر تک انگلینڈ کا سفر ہو۔ آج برسوں سے لندن کے احباب بسلسلۂ تقریر علامہ نظامی کو مدعو کرتے ہیں۔ مگر یہاں کی مصروف زندگی سے آپ ارادہ تک نہیں فرماتے۔ اگر حضرت نے سفر فرمایا تو مناظرہ علامہ نظامی کے ہاتھ ہوگا

محمد میکائیل ضیائی بھاگلپوری۔

سنی تبلیغی جماعت کی ایک اہم نشست

۱۳ر ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۶ر اکتوبر ۱۹۷۹ء بروز شنبہ مکہ مسجد پنکھے شاہ درگاہ گھاٹ کوپر بمبئی ۱۰ ر بجے دن میں سنی تبلیغی جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل علماء کرام نے شرکت فرمائی۔

(۱) حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب (۲) حضرت مولانا عبدالحنان صاحب نعیمی (۳) مولانا عبدالرحیم صاحب (۴) مولانا ہدایت اللہ (۵) مولانا محمد طیب خان صاحب (۶) مولانا سہیل احمد دارثی (۷) مولانا سید علی احمد صاحب (۸) مولانا شاکر احمد عادل (۹) مولانا محمود عالم رشیدی (۱۰) مولانا عبدالرزاق جیلپوری (۱۱) مولانا عبدالوہاب نوری (۱۲) مولانا محمد خلیل الرحمٰن نوری (۱۳) مولانا محمد نعیم الدین رضوی (۱۴) مولانا محمد شاکر اصغر رضوی (۱۵) مولینا منور حسین صاحب (۱۶) مولانا وکیل احمد رضوی (۱۷) مولانا نورالحق نوری (۱۸) مولانا ظہیر الدین رضوی (۱۹) مولانا اسداللہ سلطانپوری (۲۰) محمد محسن عالم رضوی (۲۱) مولانا سید غلام حسین منوری (۲۲) مولانا محمد مجیب الرحمٰن صاحب (۲۳) مولٰنا انیس عالم صاحب (۲۴) مولانا محمد حنیف اعظمی (۲۵) مولانا حافظ محمد عمر صاحب (۲۶) مولانا ضیاء المصطفٰے صاحب (۲۷) مولانا حافظ فاروق احمد صاحب (۲۸) مولانا غلام سرور صاحب (۲۹) مولانا سراج اظہر صاحب (۳۰) حافظ سلطان صاحب (۳۱) حافظ سہراب صاحب (۳۲) مولانا اقبال عزیزی (۳۳) غلام حسین صاحب شافعی (۳۴) مولانا شہاب الدین (۳۵) قاری نسیم صاحب دانجہ داڑی (۳۶) مولانا ابو مصطفٰی (۳۷) مولانا حجت نظامی (۳۸) مولانا زین الدین صاحب نعیمی

اور

حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں۔

۱۔ آج کی نشست میں علماء اور ائمہ مساجد نے بہ اتفاق آرا اس تجویز کو پاس کیا کہ سنی تبلیغی جماعت وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس میں عوام و خواص کو برابر کا شریک ہونا چاہیئے۔

۲۔ ائمہ مساجد نے بہ اتفاق رائے یہ بھی طے کیا کہ سنی مساجد میں روزانہ درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ اور جب تک سنی تبلیغی جماعت کا نصاب منظر عام پر نہیں آتا اس وقت تک امام کسی بھی سنی عالم کی کسی کتاب کو اپنی صوابدید کے تحت منتخب کر سکتا ہے۔

۳۔ بہ اتفاق رائے یہ بھی طے پایا کہ ہر ماہ سنی تبلیغی جماعت کی ماہانہ نشست ہونی چاہیئے اور یہ نشست ہر ماہ علیحدہ علیحدہ مقام پر ہوا کرے گی۔

۴۔ یہ بھی بہ اتفاق رائے طے پایا کہ ہر ہفتے میں علیحدہ علیحدہ مقامات پر ہفتہ وار اجتماع ہوا کرے گا۔

۵۔ تمام حلقہ ہائے بمبئی کے لئے حسب ذیل حضرات سربراہ و نگراں مقرر کئے گئے۔

۱۔ مولانا انیس عالم صاحب گھاٹ کوپر ۲۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کرلا ۳۔ مولانا وکیل احمد صاحب، مولانا ظہیر الدین صاحب دھاراوی ماہم شریف ۴۔ مولانا امین الدین صاحب اندھیری ۵۔ مولانا صوفی شاہ خلیل احمد صاحب وڈالا ۶۔ مولانا سراج اظہر صاحب بھول والی گلی ۷۔ مولانا عبدالحنان صاحب نعیمی گونڈی ۸۔ مولانا زاہد اللہ صاحب جمبور۔ اور اس کے نگراں و سربراہ اعلیٰ مولانا عبدالقیوم صاحب مظفر پوری امام مکہ مسجد پنکھے شاہ درگاہ مقرر کئے گئے۔

ماہنامہ "پاسبان" کی قیمت میں اضافہ

کتابت و طباعت اور کاغذ کی ہوش ربا گرانی کے پیش نظر مارچ ۸۰ء کے شمارے سے ماہنامہ پاسبان کی قیمت فی کاپی دو روپئے اور سالانہ بیس روپے ہوگی۔ ایجنٹ حضرات نیز قارئین پاسبان نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)